جگنوؤں کے قافلے

(افسانے)

نیلم احمد بشیر

جگنوؤں کے قافلے

(افسانے)

نیلم احمد بشیر

ماں

نیچے استقبالیہ پہ بیٹھے شخص نے بتایا کہ میڈم سیمی کی کلاس اوپر کی منزل میں ہوتی ہے۔ ناہید زری کا ہاتھ تھامے کلچرل انسٹیٹیوٹ کی گول پرانی طرز کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

یہ پارسی ڈانس ٹیچر کوئی معمولی ڈانس ٹیچر نہیں تھی بلکہ اپنے زمانے کی مشہور فلمی رقاصہ رہ چکی تھی اور بہت غضب کا کلاسیکی ناچ جانتی تھی۔ ابھی کچھ ہی روز پہلے ٹی وی پہ ایک پرانی فلم چل رہی تھی جس میں میڈم سیمی کا رقص موجود تھا مگر سنسر کی وجہ سے دکھایا نہ جا سکا تھا اور اس کمی کو ناظرین نے بہت شدت سے محسوس کیا تھا۔

ناہید کلاسیکل موسیقی اور رقص کی مداح تھی اسے یہ دیکھ کر بہت غصہ آیا تھا کہ بے ہودہ' بے ہنگم' لغو اچھل کود تو فلم میں دکھا دی گئی تھی' اس پر کسی کو اعتراض نہ ہوا تھا' مگر جیسے ہی سیمی کا کلاسیکل رقص آیا' ٹی وی والوں نے قینچی چلا دی۔ فلم میں میڈیم سیمی' شوخ و شنگ' دبلی پتلی' نازک اندام حسینہ کا روپ دھارے ہیرو کی دل پر چھریاں چلا رہی تھی۔

اس کی حقیقی زندگی کے بارے میں بھی سبھی جانتے تھے کہ اس نے عین عالم شباب اور اپنے عروج کے زمانے میں فن کی دنیا کو خیر باد کہہ کر ایک فلمی ہدایتکار سے شادی رچالی تھی مگر افسوس کہ وہ ہدایتکار اس سے وفا نہ کر سکا اور چند ہی سالوں کی رفاقت کے بعد' ایک بچی اس کی جھولی میں ڈال کر ایک ابھرتی ہوئی نوجوان اداکارہ کی زلفوں کا اسیر ہو گیا۔

دل تو اس نے سیمی کا توڑا تھا مگر دل کا عارضہ اسے لاحق ہوا اور وہ صاحب فراش رہنے لگا۔ اس کی نئی محبت نے اس سے پیسہ' جائیداد' سب کچھ اپنے نام کروالیا اور خود اس سے بے نیاز ہو گئی۔

ہدایتکار نے ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ سیمی کی گود میں آ کر سر رکھ دیا مگر وہ سیمی کی جان توڑ تیمارداری کے باوجود زندگی کی بازی ہار گیا۔

سیمی نے پھر کسی مرد پر اعتماد نہیں کیا اور اپنی بیٹی کے سر پر سایہ بن کر رقص کے سہارے زندگی بتانے لگی۔ شہر کے مختلف سکولوں میں بچوں کو رقص کی تعلیم دے کر اس نے خود کو از حد مصروف کر لیا تھا۔

زری کو اس کے سکول میں اپنی کلاس میں غیر معمولی طور پر اچھا رقص کرتے دیکھ کر ہی اس نے زری کے گھر ایک خاص نوٹس بھجوایا تھا کہ آپ کی بیٹی بہت دلجمعی سے رقص کی کلاس میں تربیت حاصل کرتی ہے۔ آپ مہربانی کر کے اسے میری کلچرل انسٹیٹیوٹ کی ''آفٹر سکول سپیشل کلاس'' میں داخلہ ضرور دلوائیں۔ یہ بچی بہت فنکارانہ صلاحیتوں کی مالک ہے۔''

ناہید نوٹس پڑھ کر مادرانہ جذبہ تفاخر سے پھولی نہ سمائی دکھائی دینے لگی مگر اس کے شوہر اسلم نے حسب توقع طوفان سر پر اٹھالیا۔

''میری بیٹی! اور کلاسیکل رقص سیکھے؟ ہرگز نہیں! غضب خدا کا ہم بچیوں کو سکولوں میں تعلیم و تربیت کے لیے بھیجتے ہیں یا ناچ گانا سیکھنے کے لیے؟ کوئی ضرورت نہیں فضول کاموں میں پڑنے کی!''

اسلم پرانے خیال کا روایتی قسم کا باپ تھا اور ناہید کو اس سے اسی ردعمل کی توقع تھی، مگر اتنی آسانی سے ہار ماننے والی وہ بھی نہ تھی۔

دیکھو نا اسلم! یہ رقص ایک خاص قسم کا فن ہے۔ عامیانہ، فلمی قسم کا ناچ نہیں ہے۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔ وقار اور ڈھنگ سے کیا جائے تو یہ عبادت کی پوتر دکھتا ہے۔ آخر مندروں میں دیوداسیاں!''

''ہم ہندو نہیں ہیں!'' اسلم نے جل کر جواب دیا اور اس کی بات کاٹ دی۔ ''بھئی ہم کیوں ہندو ہونے لگے خدانخواستہ یہ تو ہمارا تہذیبی ورثہ ہے اور تہذیب صرف مذہب سے نہیں موسموں، رویوں، مقامی روایتوں سے مل کر وجود میں آتی ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ اس میں ترامیم اور اضافوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ مان جاؤ نا پلیز!''

ناہید نے لاڈ سے اس کے پاؤں پکڑ لیے۔

ابو! ابو پلیز! مجھے جانے دیں نا! سکول میں آنٹی یہی ہمیشہ کہتی ہیں میں سب سے اچھا نرت کرتی ہوں۔ اگر میں تمہیں الگ کلاس میں سکھاؤں تو تم بہت فرسٹ کلاس ڈانسر بن سکتی ہو۔

ننھی زری اپنے باپ کے گلے میں جھول گئی اور ضد کرنے لگی۔

مان جاؤ نا پلیز اسلم! آخر ایسی بھی کونسی قیامت آ جائے گی؟ ہم نے کونسا اسے سٹیج پہ پرفارم کروانا ہے؟ بہت اچھے اچھے خاندانوں کی لڑکیوں میں فنون لطیفہ کا رجحان ہے اب تو۔''

ناہید منت سماجت کرنے لگی۔

اور اگر خاندان والوں کو پتہ چل گیا تو؟ اسلم کچھ نرم پڑنے لگا۔

ہم بھلا کیوں کسی کو بتانے لگے؟ بچی چھوٹی ہے اس کا شوق ہے۔ پورا کر لینے دو اور جن خاندان والوں کا آپ حوالہ دے رہے ہیں' وہاں بھلا کیا نہیں ہو رہا؟ اب میرا منہ نہ کھلوائیں۔

ناہید نے لاڈ سے منہ پھلا لیا۔

اس کا اشارہ اپنے بڑے جیٹھ کے بچوں کی طرف تھا۔ خود تو بھائی جان تبلیغی جماعت میں شامل ہو کر گھر بار تیاگ چکے تھے اور بڑے بیٹے نے امریکہ جا کر ایک ماڈل گرل سے شادی رچالی تھی۔

اسلم نے ماں بیٹی کی ضد کے آگے ہتھیار پھینک دیئے۔

اوپر کی منزل میں کئی کمرے تھے۔ ناہید اس کمرے کے باہر جا کر رک گئی جس کے بند دروازے کے آگے چھوٹی بڑی' مختلف ناپ کی کچھ جوتیاں پڑی تھیں۔ اس نے دروازہ کھولنے کی نیت سے ہاتھ آگے کو بڑھایا اور پل بھر کو سوچ میں پڑ گئی۔

بند دروازے کے اس طرف' ماضی کی کتنی عظیم رقاصہ' گلیمر کی دنیا کی شہزادی' رقص میں مصروف ہو گی۔ گھنگروؤں کی چھنک اور طبلے کی تھاپ پہ جھومتی' بل کھاتی' رنگ برنگے ملبوسات پہنے لڑکیاں ننھی ننھی پریاں دکھ رہی ہوں گی۔ سر اور تال کا ایک بہتا دریا ٹھاٹھیں مار رہا ہو گا مگر یہ کیا۔

دروازے کو کھولتے ہی ایک سنجیدہ سی' غیر متوقع خوشی نے اس کا استقبال کیا تھا۔

باہر سخت گرمی تھی مگر کمرے کے اندر ایئر کنڈیشنر کے چلنے سے ٹھنڈک تھی۔ ننگے فرش پہ تین چار لڑکیاں آڑی ترچھی لیٹی آپس میں گپیں لگا رہی تھیں۔ سکول کے بعد کی تھکن' ان کے چہروں سے بخوبی عیاں تھی۔

ایک کونے میں ایک فربہ جسم' گوری چٹی' معمولی نقش و نگار کی مالک' ادھیڑ عمر عورت' سر پہ سکارف باندھے کچھ پڑھنے میں مشغول تھی۔ ناہید اور زری کے اندر آنے کی آواز سن کر اس نے اپنا جھکا ہوا سر اپنی عجیب و غریب زبان میں لکھی ہوئی کتاب سے اٹھایا اور مسکرا دی۔

آپ زری کو لے آئیں! بہت اچھا کیا۔ میں تو اسے بہت دفعہ کہہ چکی ہوں کہ یہ میرے پاس ضرور آئے' بہت اچھا ناچتی ہے آپ کی بچی۔ آپ کے لیے تو یہ بہت فخر کی بات ہے کہ اس میں اتنا ٹیلنٹ ہے۔ یقین کیجیے ہر لڑکی میں نہیں ہوتا۔ وہ بولتے بولتے زری کو پیار کرنے لگی۔

ناہید نے اسے ساری رام کہانی سنائی کہ اسے زری کے باپ کو منوانے میں کتنی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا وغیرہ وغیرہ۔

''کیا آج سب بچیاں نہیں آئیں؟'' ناہید نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

دراصل کلاس ساڑھے تین بجے ہوتی ہے۔ابھی پندرہ منٹ باقی ہیں۔آہستہ آہستہ لڑکیاں آتی جائیں گی تو ہم شروع کر دیں گے۔اسی لیے میں بھی بیٹھی اپنے ایشٹ پڑھ رہی تھی۔ویسے تو دن بھر ٹائم نہیں ملتا مگر میں کوشش کرتی ہوں کہ ہر کلاس کی ابتداء پاک کلام پڑھ کر ہی کروں۔

میڈیم اپنی مقدس کتاب کو آنکھوں سے لگایا' چوما اور غلاف میں لپیٹ کر اپنے بیگ میں ڈال لیا۔

تھوڑی تھوڑی دیر بعد لڑکیاں آتی رہیں اور کمرہ بھر گیا۔کچھ کی مائیں انہیں چھوڑ کر چلی گئیں اور ایک آدھ ناہید کی طرح میڈم سیمی سے بات چیت کرنے کو ٹھہر گئی۔

سیمی بہت ہنس مکھ اور سادہ طبیعت عورت تھی۔بات بات پر لڑکیوں کو گود میں بھر بھر کر پچ پچ کرنے لگتی اور لڑکیاں بھی آنٹی سیمی' آنٹی سیمی کہتے نہ تھکتیں۔بے تکلف سا دوستانہ ماحول تھا۔

جب زری نے بھی دوسری بچیوں کے ساتھ قطار میں کھڑے ہو کر' کتھک ' کے ایک دو خوبصورت مدرے' کیے تو اس کا مدھر انداز اور دلکش چہرے پہ چھائی مسرت کو دیکھ کر زری کے دل میں خوشی کا ایک انوکھا سا جذبہ پیدا ہوا۔ایسا پیارا رقص تو ان کے خاندان میں کبھی کسی نے نہیں کیا تھا۔

ناہید اپنی بیٹی زری کو باقاعدگی سے ہفتے میں تین بار ڈانس کلاس کے لیے لاتے لاتے میڈم سیمی سے کافی بے تکلف ہو گئی تھی۔

سیمی اس سے کبھی کبھار چائے کی بریک کے دوران ادھر ادھر کی باتیں اور اپنے پرانے قصے بھی کہہ ڈالتی۔

''مگر سیمی آنٹی آپ نے اپنے شوہر کو بے وفائی کے باوجود معاف کیسے کر دیا؟ اسے پھر کیوں اپنی زندگی میں آنے دیا۔جبکہ اس نے آپ کے ساتھ اتنی زیادتی کی؟''

ناہید ایک روز کہہ اٹھی۔

''ارے بیٹا کیا کرتی۔غریب کنگال ہو گیا تھا۔دل کا مریض تھا۔میرے قدموں میں آ کر لوٹنے لگا' تو میں اپنی نرم دلی کے ہاتھوں مجبور ہو گئی۔میری ماں مجھے بہت کوستی تھی۔کہتی تھیں کہ میں بہت بیوقوف ہوں۔اس بے قدر انسان کے لیے اپنا سب کچھ برباد کر دیا اور پھر اس کی تیمارداری بھی کرتی ہوں۔مجھے پاگل سمجھتی تھیں مگر میں کیا کرتی مجبور تھی۔آخر وہ میری بیٹی کا باپ تھا۔مجھے اس پر ترس آ گیا تھا اس لیے اسے پھر سے سہارا دینے لگی!

یمی کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔

مگر اب میری زندگی صرف میری بیٹی اور میرے رقص کے اردگرد گھومتی ہے۔ ماں تو اللہ کو پیاری ہو گئیں اب بیٹی کی ذمہ داریاں پورا کرنا میرا فرض اور رقص میری جدوجہد میری عبادت ہے۔ میں تو اللہ کا شکر کرتی ہوں کہ یہ ایک ایسا تحفہ اس نے مجھے عطا کر دیا ہے کہ اسے میں جتنا خرچ کرتی ہوں یا بانٹتی ہوں' اتنا ہی بڑھتا چلا جاتا ہے۔''

یمی فلسفیانہ انداز میں بولتی چلی گئی۔

''مگر آنٹی ہمارے معاشرے میں رقص کے خلاف اتنا تعصب ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگوں کو کس طرح اس آرٹ فارم کی صحیح شناخت کروائی جا سکے۔ تنگ نظری اور جہالت میں ہم لوگ اندھے اور گونگے بہرے بن جاتے ہیں!''

ناہید اظہار خیال کرنے لگی۔

''ادھر آؤ بچو! سب لوگ میرے پاس آ جاؤ! میں آپ لوگوں کو ایک چھوٹا سا لیکچر دینا چاہتی ہوں!'' یمی نے تالی بجا کر بچیوں کو اپنے پاس بلا لیا۔ بچیاں ہمہ تن گوش ہو گئیں۔

دیکھو گرلز! ڈانس بری چیز نہیں ہے۔ کوئی عمل بذات خود برا نہیں ہوتا' صرف اس کے کرنے والے ہی اس کے اچھے یا برے طریقے سے اس کا مظاہرہ کرنے کی وجہ سے قابل گرفت ٹھہرائے جا سکتے ہیں۔

رقص کیا ہے؟ ایک قدرتی اور بے ساختہ عمل ہے۔ کیا آپ نے مزاروں پر وجد میں آ کر ناچتے عاشقان رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اللہ کے پیاروں کو کبھی نہیں دیکھا؟ وہ کیا کر رہے ہوتے ہیں؟ صرف اپنے جذبۂ عقیدت کا اظہار ہی تو کر رہے ہوتے ہیں اور خوشی کے اظہار کا اس سے زیادہ خوبصورت طریقہ کیا ہو سکتا ہے۔ بندہ اپنے آپ کو ہی بھول جائے۔ تمام Inhibitions سے آزاد ہو جائے۔ چاہے پل بھر کو ہی سہی' ضبط کے بندھن توڑ کر اپنے جسم کو بے اختیار ہو جانے کا موقعہ فراہم کرے۔

رقص کرتے وقت انسان' ایک عجیب سی آزادی محسوس کرتا ہے۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ جسم کے خول میں مقید روح اس میں چابی بھر دیتی ہے اور جسم تیرنے لگتا ہے' اڑنے لگتا ہے اور ایک ایسی فرحت بخش کیفیت کے مزے لوٹنے لگتا ہے کہ اس پر ایک نشہ سا چھانے لگتا ہے آپ لوگوں نے دیکھا یا کم از کم سنا ضرور ہو گا کہ دیہات میں جب فصلوں کی کٹائی کا موسم آتا ہے تو کسان مرد عورتیں مل جل کر خوشی سے رقص کرتے' جھومتے اور جشن مناتے ہیں۔ اس وقت رقص کوئی گناہ نہیں بلکہ ان کے سچے اور خالص جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔

اور کیا قدرت کے نظام میں رقص شامل نہیں؟ غور کریں تو زمین' آسمان' سورج' چاند' ایک دوسرے کے سامنے ناچتے ناچتے

آئے اور اپنا اپنا ایکٹ ختم کر لینے کے بعد دھیرے دھیرے سٹیج کے پیچھے جا چھپتے ہیں۔

کونجوں کی ڈار کی یکساں پرواز' دیگر پرندوں کا اڑتے اڑتے کبھی ایک طرف کو جھکنا' لپکنا' کبھی نیچے آنا پھر جھٹکے سے اوپر کو اٹھ جانا' گھنے جنگلوں میں ناچتی شور مچاتی بارشوں میں مست ہو کر موروں کا پنکھ پھیلانا اور پھر ناچ اٹھنا' ان کی آزادی کا ایک عمل ہے۔ اعضاء کی شاعری ہے۔

کیڑے مکوڑے بھی ناچتے ہیں بلکہ ایک خاص قسم کا مکڑا تو اپنی مادہ کی توجہ حاصل کرنے کے لیے پہلے ناچتا ہے' اس کا دل لبھاتا ہے' تب جا کر وہ متاثر ہوتی ہے۔ میرے نزدیک یہ ایک مکمل قدرتی عمل ہے جس میں بناوٹ کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ جہاں تک ہمارا' اپنی بچیوں کو رقص کی تعلیم دینے کا تعلق ہے تو میں اس کے بارے میں آپ کو یقین دلا دوں کہ یہ فحاشی کی علامت نہیں ہے۔ فحاشی اس آرٹ میں نہیں بلکہ دیکھنے والوں کی نظر اور دل میں ہوتی ہے۔ اس میں اتنی کٹھن ٹریننگ اور محنت شامل ہوتی ہے کہ اس سے بچیوں میں ڈسپلن' شخصیت میں اعتماد' وقار اور نظم و ضبط پیدا ہو جاتا ہے۔

جسمانی طور پر لڑکیوں کی نسوانیت میں چار چاند لگ جاتے ہیں اور ان کے اندر ایک شانتی' ایک سکھ چین راج کرنے لگ جاتا ہے۔

اس صدیوں پرانے فن کو ہمیں زندہ رکھنا ہے' آگے بڑھانا ہے۔ سب سے پہلے نئی نسل میں اس کے لیے آگہی اور شعور کو بیدار کرنا ہے ہم اپنی بچیوں میں اس شوق کی شمع جلائیں گے' دیئے سے دیا جلے گا تو روشنی آگے پھیلے گی نا۔"

میڈم یسی کی آواز فور جذبات سے کانپ رہی تھی۔

قدرت ہمارے چار سو رقص کرتی نظر آتی ہے۔ مہکتی ہواؤں کے شریر جھونکوں سے اٹھکیلیاں کرتے پتوں کا ناچ' اور سمندر کی منہ زور لہروں کا ایک خاص مقررہ ردھم کے ساتھ اتار چڑھاؤ' ننھی لڑکیوں کا رنگ برنگے ملبوسات میں پریوں کی طرح نرت کرنا' یہ سب صرف اور صرف اور صرف زندگی کی سیلی بریشن ہے' ایک کائناتی سچائی ہے۔

جو رقص کرتا ہے اس کے صرف جسم میں ہی نہیں بلکہ رویوں' سوچوں نظریات میں بھی ہارمنی Harmony کا ٹانکہ لگ جاتا ہے۔

بچیاں ہمہ تن گوش تھیں۔ کچھ ہی دیر میں لاس کا وقت ختم ہو گیا اور سب اپنے اپنے گھروں کو سدھارے۔

یوں تو میڈیم یسی اکثر خوش خوش رہتی اور زندہ دلی سے باتیں کیا کرتی لیکن کبھی کبھار اس پر یاسیت بھی غلبہ پا لیتی تھی خاص طور

پر ان دنوں وہ بڑی پریشان ہو جاتی جب اسے جوڑوں کے درد کا اٹیک ہوتا۔ ایسے میں سب سے زیادہ تکلیف اسے اس بات کی ہوتی کہ وہ کلاس میں خود اٹھ کر سبق نہ دے سکتی' اسے بیٹھے بیٹھے اشارے سے بتانا پڑتا کہ اب بچیاں کیسے کریں' کس طرح پاؤں ماریں۔

برسات کی ایک ایسی ہی گیلی دوپہر تھی۔ بارش سڑکوں پہ رقص کر رہی تھی اور ماحول خوشی سے نہایاں نہایا' نکھرا نکھرا بہت بھلا لگ رہا تھا' جب میڈیم سیمی کے جوڑوں کا درد بہت بڑھ گیا۔ اس دن اس نے کلاس جلدی ختم کر لی اور سب بچوں کو گھر بھجوا دیا اگلے کچھ روز بھی جب وہ نہ آئی تو ناہید نے سوچا اس کی طبیعت پوچھ آئے اس لیے اس کے گھر چلی گئی۔

اس کا گھر ایک متوسط طبقے کے گھر کی طرح' مگر بہت فنکارانہ انداز میں سجا ہوا تھا۔ دیواروں پر جابجا میڈم سیمی کی جوانی کے فلمی کیریئر' اسٹیج شوز اور مشہور شخصیات سے ملاقاتوں کی تصاویر آویزاں تھیں۔

آتشدان میں پارسی عقیدے کے مطابق ہمیشہ جلتی رہنے والی آگ کا شعلہ جل رہا تھا اور متھرا گاڈی Hymns کی کتاب سیمی کے پہلو میں پڑی ہوئی تھی۔

ارے آؤ ناہید! کتنا اچھا کیا تم آ گئیں؟ زری کو ساتھ نہیں لائیں؟ مجھے افسوس ہے میں کچھ دنوں سے کلاس نہیں لے سکی! وہ ایک ہی سانس میں بولتی چلی گئی۔

ارے آنٹی جی! کوئی بات نہیں! آپ پہلے ٹھیک تو ہو جائیں۔ پھر کلاس بھی ہو جائے گی۔ ناہید نے اسے تسلی دی۔

بس یہ جوڑوں کا درد مجھے بستر میں پڑے رہنے پر مجبور کر دیتا ہے ورنہ تمہیں پتہ ہے مجھے کوئی طاقت اپنی بچیوں کو تعلیم دینے سے باز نہیں رکھ سکتی۔"

اب کسی طبیعت ہے؟ ناہید نے پاس رکھے گھنگھروؤں کی ایک پرانی جوڑی کو دیکھ کر دلچسپی سے ہاتھ میں اٹھالیا۔

آج کچھ بہتر ہے! اگر ہو سکا تو کل سے ضرور کلاس لوں گی! یہ میرے سب سے پہلے گھنگھرو ہیں۔ میری ماں کی طرف سے خریدا گیا میرا پہلا تحفہ!

میری مرحومہ ماں کی نشانی۔

گھنگھرو چھن سے بول اٹھے!

بچیاں آپ کو بہت مس کرتی ہیں! ناہید نے بتایا۔

میں تو خود بہت فکرمند ہو جاتی ہوں' آخر میرا فن انہوں نے ہی تو آگے بڑھانا ہے۔ میری ذمہ داری ہے کہ اپنا ورثہ قابل ہاتھوں کو سونپ کر ہی آگے جاؤں۔''

مما چائے لے لیں! چائے کی ٹرالی دھکیلتے ایک نوجوان لڑکی خاموشی سے اندر چلی آئی۔

ہیلو! ناہید کو دیکھ کر اس نے مختصراً کہا۔

ناہید نے استفسارانہ نگاہوں سے یسمی کی طرف دیکھا۔

یہ میری بیٹی نینا ہے۔ نینا' طارق۔ بی اے فائنل میں پڑھ رہی ہے۔ یسمی نے خوشدلی سے اپنی بیٹی کا تعارف کروایا۔

''اچھا! اچھا!'' ناہید نے چائے کی پیالی ہاتھ میں تھام لی۔

آپ تو بہت ماہر رقاصہ ہوں گی۔ اتنی عظیم فنکارہ کی بیٹی ہیں آپ۔ ناہید نے سادہ لباس پہنے' ڈھیلی ڈھالی چٹیا باندھے عام شکل وصورت والی لڑکی سے مخاطب ہو کر کہا۔ میڈم نے تو آپ کو اپنی صلاحیتوں کا نچوڑ دیا ہو گا۔

میڈم آپ کچھ دن کے لیے انہیں کیوں نہیں کلاس لینے کے لیے بھیج دیتیں۔ تب تک آپ کی طبیعت بھی انشاءاللہ بہتر ہو جائے گی۔

ناہید نے تجویز پیش کی۔ لڑکی نے ماں کی طرف دیکھا اور دھیرے سے بولی۔

مجھے تو ڈانس نہیں آتا۔ اور مسکرا کر چائے کے برتن سیٹ کرنے لگی۔

ارے آپ نے یہ گلاب جامن تو لیے نہیں میں نے خود بنائے ہیں۔ ہوم میڈ ہیں۔

اس نے ناہید کے آگے پلیٹ بڑھا دی۔

دراصل رات اس کے سسرال والوں کا ڈنر تھا۔ اس نے کھانا بنایا تھا۔ یہ گلاب جامن رات کے ہی بچے ہوئے ہیں۔ بہت اچھا کھانا بناتی ہے یہ!

میڈیم یسمی نے فخریہ انداز میں اپنی بیٹی کی طرف دیکھا۔

ان کی شادی ہونے والی ہے؟ ناہید کچھ حیران سی ہو گئی۔

ہاں بھئی۔ بس فائنل کا امتحان ہوتے ہی اسے تو اس کے گھر بھیج دوں گی۔ لڑکا ماشاءاللہ ایئر فورس میں پائلٹ ہے۔ بہت اچھا ہے۔ اور بھئی گڈ ہاؤس وائف کو اچھی کوکنگ تو آنی ہی چاہئے نا۔ لڑکی ذات کا اصل کام تو گھرداری ہی ہے نا اور شکر ہے کہ اس میں یہ

بہت ماہر ہے۔ اچھا مما' میں چلوں' آپ لوگ گپ شپ لگائیں۔ مجھے ایک ٹیسٹ کے لیے پڑھنا ہے۔

نینا چائے کی ٹرالی اٹھائے کچن کی طرف چلی گئی۔

آنٹی یسمی' میں کچھ سمجھی نہیں۔ میں تو سمجھ رہی تھی آپ کی بیٹی بھی آپ کی طرح رقص کے فن کو زندگی سمجھتی ہوگی اور اسے اس میں بہت اعلیٰ مقام حاصل ہوگا۔ معاف کیجئے گا۔ کہیں آپ اپنی بیٹی کے معاملے میں قدامت پسند تو نہیں ہوگئیں؟ دوسروں کی بیٹیوں کو تو آپ رقص سکھانے پر اتنا اصرار کرتی ہیں۔ ناہید اپنے لہجے کے ہلکے سے طنز کو نہ چھپا سکی۔

میڈم یسمی یکدم اداس ہوگئی۔ اس نے بستر سے اٹھ کر کمرے کے ایک کونے میں پڑے پرانے گراموفون میں چابی بھرنی شروع کردی۔ ناہید نے ایسا گراموفون' اینٹیک شاپس یا بس فلموں میں ہی دیکھ رکھا تھا۔ پرانا کالا ریکارڈ مدھم سروں میں بجنے لگا۔

موہے پنگھٹ پہ نندلال چھیڑ گیو رے۔ نہ جانے کس پانی سنگر کی آواز تھی ناہید کو کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا۔

یہ بات نہیں! میں نے نینا کو جان بوجھ کر رقص نہیں سکھایا۔ اس لیے نہیں کہ مجھے رقص سے پیار نہیں۔ مگر اس لیے مجھے نینا سے' رقص سے بھی زیادہ پیار ہے۔ میں اور میری ماں اکیلے تھے۔ اسی طرح مجھے اور نینا کو بھی اکیلے ہی ہونا تھا۔ میں نہیں چاہتی تھی میں اپنی ماں بن جاؤں! میڈم نے دیوار پر لگی ایک بوڑھی پارسی عورت کی طرف دیکھا اور پھر ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

میں نہیں چاہتی تھی کہ ہم دونوں ماں بیٹی کی زندگی میں بھی ایک ایسا دن آجائے جب میں مجبور ہو کر اس سے کہوں' نینا بیٹی۔ بس ایک دوشو اور پکڑ لے۔ پھر نہیں کہوں گی۔ آخر اس مہینے کے مکان کا کرایہ اور دودھ والے کا بل ابھی رہتا ہے نا۔ ایک فلم اور کرنے۔ بس ایک اور۔ ایک اور!"

ناہید نے اٹھ کر گراموفون پر سے ریکارڈ کو ہٹا دیا کیونکہ وہ نہ جانے کب سے ختم ہو کر اٹک رہا تھا اور پرانے گھنگھروؤں کی جوڑی کو آہستگی اور احترام سے اٹھا کر میڈیم یسمی کے پاؤں کے قریب رکھ دیا۔



کاغذ کے پرزے

''نامنظور! نامنظور! پرانے الیکشن نامنظور! نئے الیکشن کروائے جائیں۔ ہمیں پرانی نئی کی جگہ سچ مچ نئی قیادت کی ضرورت ہے۔ ہمارا مطالبہ الیکشن الیکشن!''

الیکشن میں جیتنے کے امیدواروں نے عوام' نام کا ماسک پہنا اور ایک ہجوم پیچھے لگائے' سڑکوں پر نعرے لگوانے کے لئے خود ہی نکل پڑے۔ یہ ہجوم بھولی بھالی کالی بھیڑوں کا تھا جن کا ہمیشہ سے ایک ہی مقدر رہتا ہے کہ وہ آنکھوں پہ اندھے اعتماد کی پٹی باندھے' گلے میں رسی ڈلوائے' گھسٹتے' لڑھکتے' بہتر دنوں کی امید میں اس راستے پر بس چلتے ہی چلے جائیں جس پر انہیں لے جایا جا رہا ہو۔

پٹاری کھلی تو اب کی بار اس میں سے کوئی معمولی سانپ برآمد نہیں ہوا۔ بلکہ ایک بھوکا' خونخوار' ظالم' خودغرض' اژدھا اچھل کا باہر نکل آیا۔ اس کی باہر نکلتی' پتلی' لمبی زبان اور ہیبت ناک سائز کو دیکھ کر بھیڑیں اس کی طاقت کے آگے جھک گئیں۔

''الیکشن دیوتا! ہم آپ کے غلام ہیں! کہئے آپ کے کھانے کے لئے کیا پیش کریں؟''

اژدھا پھنکارا۔

''اچھا اچھا ابھی لائے۔''

لوگوں نے اپنی امیدیں' آرزوئیں' خواہشات اور خوش فہمیاں بوٹی بوٹی کر کے خونخوار اژدھے کا پیٹ بھرنے کے لئے اس کے آگے پھینکنا شروع کر دیں۔ مقابلہ حسب معمول دو پارٹیوں کے درمیان تھا۔ لال پارٹی اور سبز پارٹی کی ایک جیسی طاقت کو دیکھتے ہوئے یہ جانچنا مشکل تھا کہ ان میں سے کون جیتے گی اور کون کم پر خلوص ہے؟ دونوں پارٹیاں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی تھیں۔

لال پارٹی والے روٹی کپڑا اور مکان کا نعرہ لگا کر مزدوروں کسانوں اور طلباء کی اکثریت کو ساتھ ملا کر الیکشن جیتنا چاہتے تھے اور سبز پارٹی والے مذہبی نظریات کا پرچار کر کے' جنت میں رہائشی سکیموں کے پراپرٹی ڈیلر ہونے کا دعویٰ کر کے' عوام کے ووٹوں کی اکثریت حاصل کرنا چاہتے تھے۔

شہر کے ہر کونے میں الیکشن کی مہم زور و شور سے جاری تھی۔ کہیں بینر لگ رہے ہیں تو کہیں پوسٹر چسپاں کئے جا رہے ہیں۔ کہیں لاؤڈ سپیکر پر اشتہار بازی جاری ہے تو کہیں پمفلٹ تقسیم کئے جا رہے ہیں۔

چوک کے دونوں طرف' دونوں پارٹیوں کے لیڈروں کی بڑی بڑی تصاویر والے جائنٹ سائز بورڈ لگے ہوئے تھے ہر آنے جانے والا ان کی طرف نظر ڈالنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔

لال پارٹی کی لیڈر ''امی جان'' تھیں ان کی تصویر بڑی پیاری تھی۔ وہ تصویر میں اپنی مخصوص مسکراہٹ اور سفید دوپٹہ لئے ہر آنے جانے پر ممتا بھری نظریں نچھاور کرتی تھیں۔ جیسے ہی کوئی راہ گیر ان کی تصویر کے آگے رکتا تصویر کہہ اٹھتی ''ہیلو بے بی!'' اور ایک ٹافی آگے بڑھا دیتی۔

رکنے والا ''یس ماما یس ماما'' کہہ کر ٹافی پر بھوکے بچے کی طرح ٹوٹ پڑتا یہ منظر ساتھ ہی لگی بورڈ کی تصویر بھی دیکھ لیتی۔ یہ تصویر جو امی بھائی کا سا پوز مارے واسکٹ پوش سبز پارٹی کے لیڈر کی تھی وہ فوراً اپنے گنجے سر پہ رنگ برنگی وگ رکھ لیتا اور گانے لگتا۔

''اس میں مونگ پھلی کا دانہ''

وہ ایک بسکٹ عوام کی طرف بڑھاتا۔

''آئی لائک اٹ' آئی لوات'' بچہ بچہ خوشی سے جھوم اٹھتا۔

دونوں پارٹیوں نے عوام کو ہر ممکن طریقے سے اپنی طرف کھینچنے کے پورے پورے انتظام کر رکھے تھے۔ عوام سوچ رہی تھی کہ کس راستے کو منتخب کیا جائے۔ دونوں راستے ہی خوش آئند مستقبل کی امیدوں کے وعدوں کی پھول پتیوں سے مزین اور خوشنما نظر آتے تھے روشنیوں کے قمقموں سے جگمگاتے' آنکھیں خیرہ کئے دیتے تھے۔

''بیوقوفو ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے' گیت گاتے ہوئے ہمارے بتائے ہوئے راستے پر چل نکلو۔''

دونوں لیڈر انہیں اپنی بات سمجھانا چاہتے تھے اور دام الفت میں پھنسانا چاہتے تھے۔

چوک کے بیچوں بیچ بنے' گول راؤنڈ اباوٹ کے سر پہ تو ہری ہری جھنڈیاں لہرا رہی تھیں لیکن گھیرے پہ ابھی تک کسی نے کوئی اشتہار بازی نہیں کی تھی۔ گھیرا خالی تھا۔

''چل بھئی ادھر لگا دے۔''

لال پارٹی کے کارکنوں نے پوسٹر چپکانے والے کو اشارے سے بتایا۔ پوسٹر چپکانے والا لئی کی بالٹی اٹھا کر گھیرے کے قریب

جا بیٹھا اور جلدی جلدی ایک کے بعد ایک 'امی جان دوپٹے والی' کی فوٹو والے پوسٹر چپکانے لگا۔

اس کے تن بدن میں ان دو روپوں کی امید ہلچل مچا رہی تھی جو اسے شام کو اس اوور ٹائم جاب کے بعد ملنے تھے۔ وہ خوشی خوشی بڑے اہتمام سے کھمبے کے گلے میں پوسٹروں کا ہار پہنا رہا تھا کہ یکدم کسی نے ایک ٹھوکر مار کر لئی کی بالٹی اوندھی کر دی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سبز پارٹی کا ایک کارکن اسے گریبان سے پکڑ چکا تھا۔

''تیری یہ مجال' سرخ بلیچے جیسی شکل والے' میں ابھی تجھے بتاتا ہوں کہ یہاں کس کے پوسٹر لگیں گے۔''

اس نے مریل سے دو سو روپے کے امیدوار کو تھپڑ اور گھونسے رسید کرنا شروع کر دیے۔

سبز پارٹی کے کارکنوں سے بھری پیجیرو میں سے موٹے موٹے سانڈ کیے بعد دیگر اترنے لگے ان کی موٹی موٹی کمروں کے اردگرد لمبے لمبے لوہے کے گرز بندھے ہوئے تھے جنہیں انہوں نے اترتے ہی اردگرد گھمانا شروع کر دیا۔

''تمہاری یہ جرات ہماری جگہ پر اپنے پوسٹر''

اب کی بار ایک دوسرے نے بھی اسے پیٹنا شروع کر دیا۔

''معاف کر دیں' مائی باپ' میں بال بچے دار آدمی ہوں۔'' وہ چلاتا رہا لیکن کسی نہ اس کی ایک نہ سنی۔

اس نے ہاتھ پاؤں جوڑ دیئے' منتیں کیں' لیکن انہوں نے اسے اتنا مارا کہ وہ بھی لئی کی بالٹی میں سے باہر گری ہوئی لئی بن گیا۔

''ملعون جا' ہم تجھے جنت کے پلاٹوں کی ہاؤسنگ سکیم میں پلاٹ دینے سے انکار کرتے ہیں۔ خدا تجھے کبھی معاف نہیں کرے گا۔''

ایک باریش' سبز پارٹی کے ورکر نے اس کے سینے کی طرف انگلی سے ایسی لیزر بیم پھینکی کہ اس میں سے نکلتے شعلے نے پوسٹر چپکانے والے کو بھسم کر کے ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا۔

''آیا پانی نٹ کا زمانہ اس میں مونگ پھلی کا دانہ''

واسکٹ پوش لیڈر نے اپنے بورڈ میں سے مسکرا مسکرا کر گانا شروع کر دیا۔

سبز پارٹی والوں نے ''امی جان سر پہ دوپٹہ لینے والی'' کے سارے پوسٹر اتار پھینکے اور اس کی جگہ اپنے محبوب لیڈر کے پوسٹر لگانا شروع کر دیئے۔ اب ان کا کارکن اپنی لئی کی بالٹی اٹھا کر اپنے دو سو روپے انعام کے خواب دیکھنے میں مصروف' جلدی جلدی کام نپٹانے لگا۔ کتنا اچھا نظارہ تھا۔ سرسبز' خوبصورت' خوشنما گھاس پہ لہراتی' ہری ہری چوڑیوں جیسی بانکی ہری جھنڈیاں' ناچ گا رہی تھیں۔

''ٹھہرو! یہ پوسٹر بازی نہیں ہو سکتی۔تم نے ہمیں سمجھا کیا ہے؟ کیا ہم نے چوڑیاں پہن رکھی ہیں۔تمہاری یہ مجال کہ ہمارے ورکر پر ہاتھ اٹھاؤ''

ایک دوسری پجیرو سر پہ آن کھڑی ہوئی تھی اور اس میں سے بدصورت تھوتھنیوں والے سور اترنے لگے۔ان کی آنکھیں اپنی متوقع جیت کے خمار سے نشیلی ہو رہی تھیں اور ان کے ہاتھوں کی جگہ کلاشنکوفیں اگ آئی تھیں۔

گرز اور کلاشنکوفیں بوس و کنار میں مصروف ہو گئی۔سانڈوں اور سوروں نے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دی۔

''ساتھیو! کامریڈو! میں تمہیں جنت تو کیا اس زمین پر پلاٹ لے کر دوں گی جو زیادہ مشکل کام ہے۔'' امی جان دوپٹے والی اپنے بورڈ میں سے چیخ چیخ کر بولنے لگیں۔

''کفر بکتی ہے یہ ناہنجار مغرب زدہ عورت۔''

باریش سبز پوش ورکر واسکٹ والے لیڈر پر سر پر ہاتھ کر گلا پھاڑنے لگا۔ایک سانڈ اور ایک سور لڑتے لڑتے زمین پر ڈھیر ہو چکے تھے۔دونوں کے جسموں سے رسنے والا امیالے رنگ کا خون پیاسی زمین پر بہہ کر دھیرے دھیرے اس میں جذب ہونے لگا دیکھ کر یہ کہنا مشکل تھا کہ خون زیادہ پیاسا تھا کہ زمین۔

''دیکھو بھائیو یہ بات ٹھیک نہیں۔'' سانڈوں اور سوروں کے جتھے میں سے ایک ایک بندہ آگے کو بڑھا۔

''ہم دونوں پارٹیوں نے ایک ایک ورکر گنوا دیا لیکن چلو کوئی بات نہیں۔ورکر تو اور مل جائیں گے پوسٹر لگانے کے لئے اس سے بہتر گول چکر کا گھیرا ہمیں نصیب نہیں ہوگا' اس لئے کیوں نہ ہم دونوں پارٹیاں ہی کچھ سمجھوتے والی بات کرلیں۔آپس میں ہی معاملہ طے کرلیں' تاکہ وقت ضائع نہ ہو۔دیکھو نا شام پڑنے والی ہے' اور پھر شام ضائع تو نہیں کرنی نا۔''

اس نے شرارت سے آنکھ ماری۔دوسرے سب لوگ ہنس پڑے۔''کتنی اچھی بات کر رہے ہیں بھائی جان آپ! اصلح صفائی بہت پیاری چیز ہے کئے کیا کریں؟'' گرز والے نے اپنا گرز فولڈ کر کے رکھ دیا۔کلاشنکوف کے ہاتھ والے کی کلاشنکوف بھی یکا یک یوں جھڑ گئی جس طرح سگریٹ سے بجھتی ہوئی راکھ جھڑ جاتی ہے۔

''آیئے بھائی جان' گلے ملتے ہیں اور ایسا کرتے ہیں کہ آدھا گھیرا آپ لے لیں اور آدھا ہم۔دونوں اچھے اچھے بھائی' مل مل کر پیارے پیارے پوسٹر لگوا لیتے ہیں ٹھیک ہے نا!''

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے بھئی'' دونوں پارٹیوں نے تالیاں بجانی شروع کر دیں۔

''بھائی جان ان دونوں کا کیا کریں؟'' ایک نے دوسرے سے پوچھا اور دونوں پوسٹر چپکانے والوں کی لاشوں کی طرف اشارہ کیا۔

''یار بورنہ کر خود ہی کارپوریشن والے لے جائیں گے صبح کوڑے کے ساتھ۔''

''چلو بھئی پوسٹر لگواؤ۔ پھر جا کر اچھی سی چائے پیتے ہیں۔''

اب دونوں پارٹیوں کے پوسٹر سے گول چکر کا گھیرا سج چکا تھا۔ دونوں پارٹیوں والے ہاتھ ملا کر شب بخیر کہہ کر جا چکے تھے۔

''ادھر آ کہاں مرجاتا ہے میرے ساتھ رہا کر'' بوڑھی افغانی دادی نے اپنے سات آٹھ سالہ پوتے کو کوڑے کے ڈھیر میں سے ایک ٹوٹا ہوا کھلونا چنتے ہوئے دیکھ کر آواز دی۔

آج کل کتنے اچھے دن ہیں۔ ٹھیک ٹھاک دیہاڑی لگ جاتی ہے۔ چالیس روپے من کے حساب سے بھی کاغذ چن کر لے جاؤ تو پچاس ساٹھ تو بن ہی جاتے ہیں۔

بوڑھی دادی نے دل ہی دل میں سوچا اور اپنے کھلنڈرے پوتے کی طرف دیکھنے لگی۔ صبح صبح کام کا وقت ہوتا ہے مگر یہ بچہ کہنا نہیں سنتا بس کھیلنے کی دھن سوار رہتی ہے اس پر۔

''دادی ٹھیک ہے۔''

اس کے میلے کچیلے ننھے پوتے نے گول چکر کے اردگرد کے گھیرے پہ لگے لال اور سبز پوسٹروں پہ نظر ڈال کر اجازت مانگی۔

''ٹھہر جا رے شیطان! تجھ سے اکیلے بھلا یہ کام کہاں ہوگا۔ میں بھی تیرے ساتھ لگوں گی تو کچھ بنے گا نا۔''

دادی خوشی اور فخر سے اپنے پوتے کی نئی دریافت پہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔ اپنا بڑا سا جھولا لٹکا کر اس کے پاس چلی آئی اور دونوں نے مل کر جلدی جلدی گھیرے پر چپکے کاغذوں کے ٹکڑے نوچ نوچ کر اپنا جھولا بھرنا شروع کر دیا۔



کیکٹس کا پھول

''زیبی! زیبی! بھئی میری قمیض نہیں مل رہی نہ جانے کہاں چلی گئی' ادھر ہی تو پڑی تھی رات کو۔''
منیر جھلاتے ہوئے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اسے آفس کو دیر ہو رہی تھی مگر نہ جانے قمیض کہاں غائب ہو گئی تھی۔
''یہ لیجئے جناب آپ کی داسی اسے استری کرنے کے لئے اٹھا کر لے گئی تھی۔ ساری سلوٹیں نظر آ رہی تھیں' بھلا اس طرح اب آپ کیسے دفتر جا سکتے ہیں۔ اب میں آ گئی ہوں نا اب آپ کو ہر چیز طریقے اور قرینے سے ملے گی جناب!'' زیبی نے کچھ اترا کر کہا۔
''ہاں بھئی اب تو بفضل خدا ہم بھی شادی شدہ ہو گئے ہیں کوئی ہمارا بھی خیال رکھتا ہے۔ شکریہ جناب آپ کی مہربانیاں ہیں ورنہ بندہ کس قابل تھا۔''
''اچھا دیکھو ابھی تم نئی نئی آئی ہو۔ نیو یارک بڑا کتا شہر ہے۔ بلڈنگ میں سے باہر بالکل نہیں جانا۔ جب تک کچھ تھوڑا بہت اندازہ نہ ہو جائے اکیلی نہ جانا۔ شام کو جب میں آؤں گا تو اکٹھے گھومنے چلیں گے۔ ٹھیک ہے؟''
''جی! لیکن میں نے کپڑے دھونے ہیں اور مشین تو آپ نے بتایا ہے کہ نیچے بلڈنگ کی بیسمنٹ میں ہے۔ نیچے تو جا سکتی ہوں نا؟ وہاں تو کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔''
''ہاں ٹھیک ہے نیچے چلی جانا۔ کوارٹرز اور ڈائمز کے سکے یہاں اس ڈبے میں' میں نے اکٹھے کر رکھے ہیں۔ دو کوارٹرز اور دو ڈائمز واشر میں ڈالیں گے اور اسی طرح ڈرائیر میں بھی اتنے ہی سکے ڈالنا ہوں گے اور ڈٹرجنٹ وغیرہ۔۔۔۔۔۔۔''
''بابا ڈھونڈ لوں گی' کہاں رکھا ہے سب سامان۔ آپ فکر نہ کریں۔ آخر آپ کی گھر والی اب آ گئی ہے خود ہی گھر کو سنبھال لے گی آپ بس بے فکر ہو کر دفتر جائیں۔'' زیبی نے اپنے میاں کے گلے میں لاڈ سے بانہیں ڈال دیں اور اپنا چہرہ اس کے آگے کر دیا۔
منیر نے پھول سے شگفتہ چہرے کو سامنے پا کر اسے ہولے سے پیار سے تھپتھپا دیا اور سرگوشی کی۔ ''مائی سویٹ ڈارلنگ''
زیبا مسکرا دی۔ لیکن اس کے چہرے پر ہلکے سے ناگواری کے تاثرات پھر بھی آ گئے۔ اسے جتنی اس لفظ ڈارلنگ سے چڑ تھی'

اتنا ہی منیر اسے پیار کرتے ہوئے یہ کہہ کر مخاطب کیا کرتا تھا۔ ویسے تو وہ اسے زیبی' زیبی کہہ کر بلاتا لیکن جیسے اس کا موڈ رومان پروری کی طرف آمادہ ہوتا' بس بے اختیار آنکھیں بند کر کے اسے ''ڈارلنگ ڈارلنگ'' کہنے لگ جاتا۔

نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ اب سب کچھ گلابی گلابی سا تھا' زیبا نہیں چاہتی تھی کہ وہ کسی بات سے اپنے شوہر کو رنجیدہ کر دے۔ دل ہی دل میں سوچتی' کچھ عرصہ اور گزر گیا تو انہیں بتادوں گی کہ مجھے ڈارلنگ نہ کہا کریں۔ کچھ بھی کہہ لیا کریں۔۔۔۔۔۔ ہنی' سویٹ ہارٹ!۔۔۔۔۔۔ کچھ بھی' مجھے گوارا ہوگا لیکن ڈارلنگ نہیں۔

دراصل ڈارلنگ کا خطاب اسے بڑا فلمی' گھٹیا اور عامیانہ سا لگتا۔ وہ سمجھتی تھی ان کا پیار مقدس' اعلیٰ اور ارفع ہے۔ اس لئے پیار کے نازک لمحات کے لئے پیاری پیاری نفیس باتیں ہی ہونا چاہئیں۔ جب کالی رات آسمان سے نیچے سرکتی سرکتی ان کے اپارٹمنٹ میں اتر آتی' ان کے دل ایک ہو کر دھڑکنے لگتے' ہر سو پریوں کا ناچ شروع ہو جاتا' چاند ستارے جشن سا منانے لگ جاتے تو زیبا اپنے محبوب شوہر کا قرب پا کر ساتویں آسمان پر پرواز کرنے لگ جاتی اور دھرتی اپنا سانس روک لیتی۔ کیف ونشاط میں ڈوبا وہ اسے ڈارلنگ ڈارلنگ پکار اٹھتا اور وہ ایک اچھی انڈراسٹینڈنگ بیوی بنتے ہوئے بڑے حوصلے سے اس کے اس خطاب کو برداشت کر جاتی۔ اتنا چاہنے والا خاوند پا کر وہ اپنی قسمت پر ناز کرتی اور لاکھ لاکھ شکر بجالاتی۔

''یونو زیبی! جب سے تم میری زندگی میں آئی ہو میری اندھیری راتیں روشن اور سونے دن دلچسپ اور رنگین لگنے لگے ہیں۔ پہلے تو میں اس پردیس میں' اپنی دھرتی سے دور' اداس اور پریشان خاموشی سے دن گزار دیا کرتا تھا۔ میں صحرا میں اگے کیکٹس کے اس تنہا پودے کی مانند تھا جس پر صرف کانٹے ہی کانٹے اگے ہوتے ہیں مگر وہ پھر بھی اکا دکا گلابی پھولوں کی حسرت میں جئے چلا جاتا ہے' جئے چلا جاتا ہے۔ پھر تم آئیں' یوں جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے۔ جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آجائے۔''

وہ شاعری پر اتر آتا اور نئی نویلی دلہن کا من خوشی سے ناچ اٹھتا۔

منیر دو تین سال سے نیویارک میں مقیم تھا۔ اس کا ایکسپورٹ امپورٹ کا دفتر مین ہٹن میں تھا مگر اس نے رہائش کوئنز میں رکھی ہوئی تھی کیونکہ کوئنز نسبتاً خاموش اور رہائش کے لئے زیادہ مناسب علاقہ تھا۔

شادی تو اس نے پاکستان میں دو سال پہلے ہی کر لی تھی لیکن اس کی بیوی کو ویزا اب ملا تھا اس لئے ویزا ملتے ہی وہ اپنے شوہر کے پاس چلی آئی تھی۔ منیر زیبا کا ہر طرح سے خیال رکھتا تھا۔

دن بھر وہ اپنے اپارٹمنٹ کی صفائی اور گھر کے دیگر کام کاج میں مصروف رہنے کی کوشش کرتی مگر ابھی چونکہ نئی نئی امریکہ آئی تھی اس لئے اسے کئی باتوں کا' معمولات کا علم نہیں ہو سکا تھا۔

شام کو منیر آتا تو وہ مل کر گھر کا سودا سلف لاتے' پھر شاپنگ کرتے اور سیر و سیاحت کرنے نکل جاتے۔ منیر اور زیبا کا وقت ایک دوسرے کے ساتھ اچھا بہت گزر رہا تھا۔

اس روز منیر کو تیاری کروا کر دفتر بھیجنے کے بعد زیبا نے شب خوابی کا لباس تبدیل کر کے لانڈری باسکٹ میں کپڑے ڈالے اور نیچے بیسمنٹ میں جا کر کپڑے دھونے کے لئے سکے تلاش کرنے شروع کر دیئے سکے گننے کے بعد دوسرا مرحلہ ڈٹرجنٹ Fabric Softner بلیچ Bleach وغیرہ ڈھونڈنے کا تھا۔ منیر سے اس نے کہہ تو دیا تھا مگر اب اسے یہ سب سامان مل ہی نہیں رہا تھا۔ نہ جانے کہاں رکھ چھوڑا تھا' اسے الماریوں میں اچھی طرح جھانکنے کے باوجود ابھی تک ناکامی ہو رہی تھی۔ وہ آج پہلی بار کپڑے دھونے جا رہی تھی مگر صابن ہی نہیں مل رہا تھا۔ یکا یک دروازے پر کسی نے بیل بجائی۔

زیبا نے سوراخ میں سے جھانک کر دیکھا۔ کوئی امریکہ لڑکی دکھائی دی۔ زیبا نے زنجیر تھوڑی سی ہٹا کر پوچھا۔

''یس؟Yes''

''میں آپ کی ہمسائی ہوں مسز مچل' آپ کو ویلکم کہنے کے لئے یہ ہوم بیک کیک لائی ہوں۔'' آنے والی نے مسکرا کر کہا۔

''اوہ آیئے آیئے!'' زیبا نے فٹ سے دروازہ کھول دیا۔ خوبصورت لمبے بالوں والی ہمسائی چست جینز اور چھوٹی سی ٹاپ میں ملبوس تھی۔

''میں آپ کو کافی آفر کر سکتی ہوں؟'' زیبا نے مہمان نوازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''شیور! اگر آپ کے پاس ٹائم ہو تو'' وہ بولی۔

''کیوں نہیں' میں تو لانڈری روم تک جا رہی تھی مگر ابھی اس گھر میں نئی نئی ہوں نا اس لئے کچھ مل ہی نہیں رہا۔ مثلاً کپڑے دھونے کا صابن' نہ جانے میرے شوہر نے کہاں چھپا رکھا ہے۔'' زیبا نے چولہا جلا کر پانی کی کیتلی چڑھا دی۔

مسز مچل اٹھی اور کچن کی ایک نچلی الماری کے بائیں کونے سے ڈٹرجنٹ' بلیچ اور دوسرا لانڈری کا سامان نکال کر باہر رکھ دیا۔

''ارے شکریہ! آپ نے کیسے ڈھونڈ نکالا۔ کمال ہے' میں تو کب سے ڈھونڈ رہی تھی۔'' زیبا نے متشکرانہ انداز سے اس کی طرف دیکھا۔

مسز مچل نے سگریٹ سلگایا اور اپارٹمنٹ کو غور سے دیکھنے لگی۔

''میرے اپارٹمنٹ سے کچھ بڑا لگ رہا ہے آپ کا اپارٹمنٹ'' اس نے تبصرہ کیا۔

''لیجئے! اب مجھے کافی کا ڈبہ نہیں مل رہا۔'' زیبا نے سٹول پر چڑھ کر کچن کی الماریاں جھانکنا شروع کر دیں۔

''دراصل ہم پاکستانی لوگ صبح صبح چائے پیتے ہیں۔'' زیبا نے بار بار اپنے سامنے آتا چائے کا ڈبہ دیکھ کر کہا۔

''اور ہم امریکن لوگ صبح صبح کافی پیتے ہیں۔'' مسز مچل پھر اٹھی اور کچن کی الماری کے ایک مخصوص کونے سے کافی کا ڈبہ نکال کر کچن کاؤنٹر پر رکھ دیا۔

''ہاؤ نائس! بھئی آپ تو بڑی ہیلپ فل ثابت ہو رہی ہیں۔ لگتا ہے آپ میرے بہت کام آئیں گی۔ ٹھیک ہے دوستی رہے گی۔'' زیبا نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

''اچھا تو آپ کہاں کام کرتی ہیں' میرا مطلب ہے۔۔۔۔۔۔''

زیبا نے یونہی سوال کر دیا کیونکہ اس کی معلومات کے مطابق زیادہ تر خواتین جاب کرتی تھیں۔

''میں گھر پر کام کرتی ہوں یعنی ہاؤس ورک' بھئی گھر کا کام بھی تو کام ہوتا ہے۔ دراصل میری طلاق کے بعد مجھے میرے سابقہ شوہر کی طرف سے Alimony کے چیک آتے ہیں تو مجھے کیا ضرورت ہے کام کرنے کی۔ دفتروں میں خواری کی۔''

وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر کش لگانے لگی۔

''آئی ایم سوری! مجھے سن کر افسوس ہوا۔'' زیبا چچ چچ کرنے لگی۔ ''اتنی پیاری اور نوجوان اورلڑکی۔۔۔۔۔۔۔۔ اور یوں تنہا۔''

''بھئی! افسوس کس بات کا؟ میں تو سیلی بریٹ کرتی ہوں کہ میری اس خبیث سے جان چھٹ گئی اور کیا' اچھا اب میں چلتی ہوں' مسز منیر! سی یو سون۔ کافی کا بہت شکریہ۔''

''شکریہ تو مجھے آپ کا ادا کرنا چاہیے۔ آپ مجھے ویلکم کرنے کے لئے کیک لائی ہیں' پلیز پھر آئیں اور میں بھی آپ کے گھر آؤں گی بائی دے وے مجھے مسز منیر نہیں بلکہ زیبا کہیے۔ مجھے اتنی فارمیلٹی پسند نہیں۔''

ٹھیک ہے زیبا! مجھے بھی آپ میرے فرسٹ نیم سے بلا سکتی ہیں۔

''اچھا یہ تو بہت اچھی بات ہے' کیا نام ہے آپ کا؟''

''ویسے تو میرا نام ڈارلین ہے لیکن پیار سے لوگ مجھے ڈارلنگ بلاتے ہیں اوکے بائے' سی یو اگین''

ہمسائی نے اٹھ کر زیبا کے گال پر ایک دوستانہ بوسہ دیا اور اپنا ویلکم کیک کا ڈبہ اٹھا کر چل دی۔



اپنی اپنی مجبوری

کھٹ! کھٹ! کھٹ! کسی نے کنڈی کی پازیب دھیرے سے بجائی۔ کچھ دیر انتظار کیا مگر غالباً کسی نے آواز سنی نہیں تھی۔ اس لئے دروازہ کھولنے کوئی نہ آیا۔

''دروازہ کھولو! دروازہ کھولو! سلمٰی! سلمٰی!''

سردیوں کی رات کو تین بجے کا ٹھٹھرا ہوا سے تھا۔ پورا محلہ گرم لحافوں میں دبکا مزید ارنیند کے خمار میں ڈوبا ہوا تھا۔ سناٹے میں نذیر حسین کی تیز آوازیں یوں ماحول کے سکوت کو چیرتی ہوئی بلند ہوئیں جس طرح سوئے ہوئے بغداد پر اسکڈ میزائلوں کا حملہ ہو گیا تھا اور کئی راکٹ بیک وقت شوں شوں کرتے اپنے خول میں سے نکل کر چاروں طرف گرنے لگے ہوں۔

متعدد بار دروازہ پیٹنے پر آخر آنے والے کو کامیابی نصیب ہو ہی گئی۔ آنکھیں ملتی سلمٰی نے گھبراہٹ میں کنڈی پر الٹے سیدھے ہاتھ مارے، دوپٹہ سر پر برابر کیا اور جلدی جلدی دروازہ کھولنے کی کوشش کی، مگر وہی ہوا جس کا اسے ڈر تھا۔

اس کے شوہر نذیر حسین کا پارہ چڑھ چکا تھا اور وہ کسی امریکن ٹینک کی طرح اسے روندڈالنے اور اس پر چڑھ دوڑنے کو تیار کھڑے تھے۔ سلمٰی سہم کر چپکے سے دروازے کے پیچھے دبک گئی۔ میاں جی نے اندر آتے ہی اسے بالوں سے پکڑ کر ایک زوردار جھٹکا دیا اور زمین پر گرا دیا ساتھ ہی تھپڑوں، ٹھڈوں، گھونسوں کے تحفوں سے بھی نوازنا شروع کر دیا۔

''مردار، کمینی، اتنی دیر سے دروازہ کھٹکھٹا رہا ہوں مگر دروازہ ہی نہیں کھول رہی کم بخت، بہری ہو گئی تھی کیا؟ سنائی نہیں دیتا؟ گھوڑے بیچ کر سو رہی تھی، حرام خوراری تجھے شرم نہیں آتی، اتنے دنوں بعد خاوند گھر آیا ہے اور تو پڑی سوتی رہتی ہے۔ دروازہ ہی نہیں کھولتی۔ اتنی نیندیں تجھے آ کیسے جاتی ہیں؟''

سلمٰی بے چاری کچھ نہ بولی۔ قصوروالی جو تھی۔ واقعی دروازہ کھولنے میں اس نے کچھ دیر لگا دی تھی۔ بارہ ایک بجے تک تو وہ جاگتی رہی تھی مگر اس کے بعد کی اسے اپنی کچھ خبر نہ رہی تھی۔ حالانکہ دل ہی دل میں اسے خدشہ تھا کہ نذیر صاحب اگر رات کے کسی پہر گھر آ گئے تو وہ کہیں سوتی ہی نہ رہ جائے مگر کیا کرتی بندہ بشر تھی، سو گئی۔

نذیر صاحب اسے صحن میں ہی مارنا شروع ہو گئے تھے۔ اندر کمروں میں لحافوں میں دبکے بچے باپ کے خوف سے مزید اندر دبک گئے۔ سلمٰی کی ساس بھی سوتی بن گئیں۔ سب کا بھلا اسی میں تھا' ورنہ ان کے غصے کے آگے کس کی مجال تھی کہ کچھ کہہ سکے۔

محلے والوں نے اب ایسے واقعات سے ڈسٹرب ہونا چھوڑ دیا تھا۔ اس لئے وہ تھوڑا بہت کسمسا کر اپنے اپنے بستروں میں ہی لیٹے رہے۔ چوبرجی کے محلوں میں صحن سے صحن' دیوار سے دیوار ملی ہوتی ہے۔ ہر ایک جانتا ہے کہ دوسرے کے گھر میں کیا ہو رہا یا ہوتا رہتا ہے۔ مار کٹائی' گھریلو جھگڑے' ان کی روزمرہ زندگی کا حصہ ہونے کی وجہ سے اپنی اہمیت کھو چکتے ہیں۔ ویسے بھی انہیں پتہ تھا کہ نذیر صاحب کئی کئی روز باہر رہنے کے بعد وقت بے وقت گھر آجایا کرتے تھے اور آنے کے بعد ایک آدھ بار تو سلمٰی کی دھنائی ضرور کیا کرتے تھے۔

یوں تو سلمٰی میں کوئی خامی بظاہر نظر نہیں آتی تھی مگر نہ جانے کیوں نذیر صاحب اس کی کسی نہ کسی بات پر اس سے ہر وقت ناراض ہی رہتے تھے۔ محلے والے ویسے دونوں کو ہی پسند کرتے تھے۔ سلمٰی بہت ہنس مکھ اور اچھے اخلاق کی مالک عورت تھی۔ ہر ایک کے کام آنا' محلے والوں کی شادی غمی میں دل سے شریک ہونا' اس کے معمولات میں شامل تھا۔ اس کا شہد جیسا میٹھا مزاج اور طبیعت کا دھیما پن اسے ہر دلعزیز بنائے ہوئے تھا۔ صورت شکل بھی اللہ نے اچھی دے رکھی تھی۔

زردی مائل سفید رنگت' ستواں ناک اور متناسب جسم۔ چہرے پر مسکراتی سی بڑی بڑی چمکدار سی بھوری آنکھیں۔ لانبے سیاہ بالوں کی چوٹی گوندھے جب وہ چلتی تو نوجوان بچوں کی ماں ہونے کے باوجود لڑکی سے دکھنے لگتی۔

نذیر صاحب شکل کے معاملے میں بس انسان کے بچے کہلائے جا سکتے تھے۔ لمبوترا سا سلونا چہرہ تھا جسے کچھ تنگ مزاج لوگ کالا بھی کہہ ڈالتے تھے کمزور نظر کی عینک کے پیچھے دو بٹن جیسی چھوٹی چھوٹی آنکھیں یوں ادھر ادھر گھومتی رہتی تھیں جیسے ہر وقت کسی شکار کے متلاشی ہوں۔ اپنے موٹے موٹے سے پیٹ کے ساتھ جب وہ گلی میں نکلتے تو نوجوان لڑکے لڑکیاں انہیں دیکھ کر کھی کھی کرنے لگ جاتے اور آپس میں ٹھٹھہ کرتے۔

دل البتہ ان کا بھی اپنی بیگم کی طرح خوبصورت تھا۔ وہ بھی محلے میں سب کے کام آنا' مدد کرنا اپنا فرض اولین سمجھتے تھے۔ ویسے تو اے جی آفس میں کوئی ملازمت کرتے تھے لیکن سال بھر سے انہوں نے چھٹی لے رکھی تھی۔ دراصل انہیں اس عمر میں تبلیغی اور رفاہی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کا چسکہ پڑ گیا تھا۔ اکثر باجماعت ٹولیوں کے ساتھ تبلیغی دوروں پر شہر سے باہر چلے جاتے اور کئی کئی دن کے بعد گھر آتے۔ نماز روزے کے پابند تو وہ تھے ہی لیکن اب جب سے ان پر اللہ کی مخلوق کی خدمت کا جنون سوار ہوا

تھا انہیں اپنے گھر بار کی بھی ہوش نہ رہی تھی۔

ابھی چند ماہ پہلے ہی محلہ والوں نے ان کی خدا ترسی کا ایک عمدہ نمونہ دیکھا تھا۔ ان کے محلے ایک بوڑھی بیوہ عورت صغراں تھی جو گئی گھروں میں جھوٹے برتن مانجھ کر اپنا اور اپنی بیٹی کا پیٹ پالا کرتی تھی۔ وہ اچانک وفات پا گئی۔ غریب کی جوان بیٹی لاوارث اور بے سہارا ہو گئی۔

قبرستان کے مشرقی حصے کی جھگی میں رہائش پذیر نجمہ کا اب اکیلا رہنا مشکل ہو گیا تھا کیونکہ کئی اوباش' آوارہ' نوجوانوں کی تھوکیں ٹپکتی بھوکی زبانیں اب گز گز بھر کی ہو کر باہر نکل آئی تھیں اور دیدے پھٹنے کو آ رہے تھے۔ یہ لڑکے نجمہ کو دیکھ کر قابو سے باہر ہو جاتے تھے اور طرح طرح سے ستانے لگتے تھے۔

محلے والوں نے کار خیر کے طور پر ایک میٹنگ بلائی اور اس یتیم لڑکی کا مسئلہ زیر غور لایا گیا۔ اس کڑے وقت میں نذیر صاحب آگے آئے اور اس بے سہارا کے سر پر تحفظ کا ہاتھ رکھ دیا۔ سادگی سے نکاح کر لیا اور گھر لے آئے۔ سب محلے والوں نے شکر کیا۔ ورنہ لڑکی رل جاتی اور اس کی مٹی پلید ہو جاتی۔ نذیر صاحب نکاح کے بغیر اسے گھر میں رکھ بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ سال ڈیڑھ میں ان کا اپنا بیٹا ان کے قد کو آنے والا تھا۔ بچے تھے اگر آپس میں بہک کر اخلاق تباہ کر لیتے تو گناہ ان پر آتا۔

اسی لئے انہوں نے نجمہ کو خاموشی سے زوجیت میں لے کر اس کی ذمہ داری اٹھائی تھی۔ شریف النفس آدمی تو پہلے ہی مشہور تھے۔ اب تو ان کی اماں نے بھی ان کے کار الٰہی میں ہمہ وقت مصروف رہنے کا سارا کریڈٹ یہ کہہ کر اپنے ذمہ لے لیا تھا کہ انہوں نے اپنا بیٹا اللہ کو سونپ دیا ہے۔

سلمیٰ نے سوکن بھی گھر میں یوں خوشی سے آنے دی جس طرح یہ بھی نذیر صاحب نے اس کے ذمے کوئی کام لگا دیا ہو۔ اور کام کو فرض شناسی سے پورا کرنا تو اس کی طبیعت میں شامل تھا۔ خاص طور پر نذیر صاحب کے کام تو وہ یوں لپک لپک کر کرتی تھی۔ جس طرح اللہ نے اسے پیدا ہی اس مقصد کے لئے کیا ہو۔

گھر میں اب اللہ رکھے دو بیویاں تھیں۔ مگر گھر کی ساری ذمہ داری سلمیٰ نے ہی اٹھا رکھی تھی۔ نذیر صاحب کے کپڑے لتے' کھانے پینے' آنے جانے سب کا انتظام اس ہی کے ذمہ تھا۔ آخر کو وہ بڑی بہو اور پرانی تھی۔ گھر کے امور کو بہتر طور پر جانتی تھی۔

ویسے بھی نجمہ کے تو ابھی گیڑی کا ڑا کھیلنے کے دن تھے۔ سترہ برس کی عمر ہوتی ہی کیا ہے۔ بچپنے اور جوانی کا اندھیرا اجالا۔ اسے تو ابھی کسی بات کی سمجھ ہی نہیں آئی تھی مگر ایک بات کا اچھی طرح سے پتہ چل گیا تھا۔ اور وہ اسی بات کے بارے میں حیران ہو ہو کر

سوچتی رہتی کہ۔۔۔۔ کس طرح اس کی زندگی کا مصرف بدل گیا تھا۔ اسے نیند بھی اتنی ہی ڈٹ کر آتی تھی جتنا ڈٹ کر وہ زندگی وہ سب نئے نئے مزے لوٹنے لگی تھی جو اسے پہلے میسر نہیں تھے۔ اچھا کھانا' اچھا پہننا' وی سی آر پر فلمیں دیکھنا' رومانی ناول پڑھنا' کیا کم مزے تھے۔ پھر نذیر صاحب کی چھوٹی بیگم بن جانے سے محلے میں جو اہمیت' احترام اور عزت اسے ملی تھی وہ بھی کسی چٹخارے دار لذت سے کم نہیں تھی۔

رہی سلمیٰ' تو اس نے تو نجمہ کو اپنی چھوٹی بہن سمجھ کر سینے سے لگا لیا تھا۔ اس لئے نجمہ کی زندگی آرام سے کٹنے لگی تھی۔ بے فکری سے چین کی نیند سوتی تھی۔ اسے کبھی خبر نہ ہوتی کہ نذیر صاحب کب اور کس طرح گھر میں آتے ہیں۔ اسے تو اس وقت ان کے آنے کا پتہ چلتا جب اس کا اپنا وجود اسے یہ خبر دیتا۔ کئی بار تو وہ خبر پا کر بھی سوتی رہتی یا سوئی بن جاتی۔ کیونکہ اسے واقعی اپنی نیند سے بہت پیار تھا۔

رات کو وقت بے وقت گھر آنے پر سلمیٰ ہی ان کے لئے' دروازہ کھولا کرتی' کھانا کھلاتی اور سواگت کیا کرتی تھی۔ انہیں دیکھ کر اس کے قدم خوشی سے زمین پر نہ ٹکتے تھے۔ تازہ پھلکا توے پر ڈال کر گرما گرم کھانا پروستی اور جتنی دیر وہ سر جھکائے کھانے میں مشغول رہتے' ان سے ان کے دورے ان کی صحت کے بارے میں پوچھ پاچھ کرتی رہتی' جس کا وہ زیادہ تر ہوں ہاں میں جواب دیتے۔ وہ باتیں کیے جاتی' اپنی مسکراتی آنکھوں سے انہیں تکتی رہتی اور وہ جلدی جلدی کھانا نگلنے کی کرتے۔ اتنے دنوں بعد گھر لوٹنے پر انہیں اب گھر کے اندر جانے کی جلدی ہوتی مگر سلمیٰ چیچڑ کی طرح ان سے چپکی جاتی۔

یہ کھالیں' وہ کھالیں' لائیں پاؤں دبادوں' تھک گئے ہوں گے۔ اللہ کتنا سامنہ نکل آیا ہے' لائیں سر میں تیل ڈال دوں۔ انہیں اس کی خدمت' اپنی اندر جانے کی جلدی کے راستے میں حائل دیوار بنی نظر آنے لگتی اور وہ جھنجلا کر اس سے پیر کھینچ لیتے۔ وہ مجبور تھی' آخر وہ تھوڑی ہی دیر کے لئے تو گھر ہوتے تھے' ان کی سیوا کے چند لذت آمیز لمحے ہی تو اس کے حصے میں آتے تھے۔ وہ انہیں کیسے چھوڑ دیتی۔

وہ بھی اپنی جگہ مجبور تھے۔ تھوڑی ہی دیر کے لئے تو وہ بھی گھر ہوتے تھے۔ اور انہیں بیویوں کے حقوق کا پوری طرح احساس تھا اسی لئے چھوٹی بیگم کو خواہ مخواہ کا انتظار کروانا انہیں اچھا نہیں لگتا تھا۔

اوپر کی منزل انہوں نے کرائے پر دے رکھی تھی۔ ان کی کرایہ دار نگہت کافی دیر سے نیچے سے آنے والی آوازوں کے ختم ہونے کے انتظار میں بستر میں لیٹی کروٹیں بدل رہی تھی۔ وہ ضبط کئے خون کے گھونٹ پی رہی تھی مگر اس کا شوہر فیاض حسب معمول

گہری نیند کے مزے لے رہا تھا۔ اس کی آنکھ شور شرابے سے کبھی نہیں کھلتی تھی۔ اس کے برعکس نگہت کی نیند اتنی کچی تھی کہ اگر چیونٹی بھی زور سے سانس لیتی تو وہ جاگ جاتی تھی۔

نیچے سے نذیر حسین کی چیختی' گرجتی' برستی آوازیں' صاف سنائی دے رہی تھیں۔ ویسے بھی رات کے تین بجے اگر نچلی منزل میں اتنا ہنگامہ ہو رہا ہو تو اس سے اس کا بے نیاز رہنا ناممکن سا تھا۔ اسے نذیر صاحب اور سلمٰی دونوں پر غصہ آنے لگا۔

اول تو ان کا اپنی بیوی کو مارنا ہی اس کے نزدیک بہت غیر شریفانہ کام تھا۔ دوسرے یہ کہ اسے ان کے مارنے کے وقت کے چناؤ پر بہت اعتراض تھا۔

بھلا اتنے مذہبی' اتنے خدا ترس آدمی کو کیا یہ نہیں پتہ تھا کہ اس وقت شور شرابا' مار کٹائی کرنے سے محلے والوں کا سکون خراب ہوتا ہوگا۔ آخر ہمسایوں کے بھی حقوق ہوتے ہیں۔ ہمسایوں کے آرام میں خلل ڈالنا کہاں کا انصاف تھا۔ ہمسائیگی چالیس گھروں تک ہوتی ہے چلو چالیس نہیں تو ان کی آواز آٹھ دس گھروں تک تو جاتی ہی ہوگی۔ گناہ صغیرہ میں تو اس کا شمار آ ہی سکتا تھا نا۔

سلمٰی پر اس لئے اسے غصہ آ رہا تھا کہ وہ یوں آرام سے مار کھا لیا کرتی تھی جس طرح یہ بھی اس کے شادی شدہ ہونے کے فرائض میں شامل تھا۔ اس کا رویہ نگہت کی سمجھ سے باہر تھا۔ اتنی خاموشی سے ظلم برداشت کر لینا' عورت ذات کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ تھا۔ نہ کوئی دنگا نہ فساد' نہ جوابی کارروائی کے طور پر گالی گلوچ' نہ طعنے' نہ کوسنے' نہ احتجاج نہ دہائی' نہ شکایت نہ شکوہ'۔۔۔۔۔ نہ جانے کیسی عورت تھی وہ۔ اس کے اس صبر کی وجہ سے محلے کی دوسری عورتوں کی بڑی سبکی ہوتی۔ ان کے ہاں تو ایسا ہوتا کہ جیسا ہی خاوند نے پہلا جھانپڑ رسید کیا تو انہوں نے وہ چیخ چہاڑ مچائی کہ الامان والحفیظ ساتھ والے گھروں سے عورتیں بچے سر نکال کر تماشہ دیکھنے لگ جاتے۔ کوئی منڈیروں پر لٹک رہا ہے تو کوئی کوٹھے پر چڑھ رہا ہے۔ سارے محلے میں ایک ایکسائٹمنٹ سی دوڑ جاتی۔

تھوڑی دیر بعد ایک دو میدان میں کود کر بیچ بچاؤ کروا دیتیں۔ خاوند بڑبڑاتا کچھ دیر کو گھر سے نکل جاتا اور بیوی رو رو کر آنکھیں سجا لیتی شوہر گھر واپس آتا تو بیوی نے سر پر پٹی باندھ رکھی ہوتی اور روٹھی شکل بنائے منہ بسور بسور کر بچوں کو کھانا دے رہی ہوتی۔

رات آتی تو میاں بیوی بن جاتے۔ صبح حالات ٹھیک ہو چکے ہوتے۔ اللہ اللہ خیر صلا

مار کھاتے وقت سلمٰی کی خاموشی کی مثالیں دے دے کر خاوند اپنی بیویوں کو شرمندہ کیا کرتے اور وہ جھینپ کر رہ جاتیں۔ جب سے سلمٰی بیاہی گئی تھی اس کے شوہر نے اس کی مہینے میں ایک آدھ بار پٹائی ضرور کی تھی مگر سلمٰی نے تو جیسے اپنے دکھ اور احساس کو ہمیشہ کے لئے صبر کی پھانسی پر چڑھا کر بے جان لاشہ بنا کر لٹکتا چھوڑ دیا تھا' اف تک نہ کرتی تھی۔

نگہت کا جی چاہ رہا تھا چیخ چیخ کر سارا محلہ سر پر اٹھا لے' ایک طوفان کھڑا کر دے۔ سلمٰی پہ کئے جانے والے ظلم کی خاطر گورنر ہاؤس کے سامنے جا کر بھوک ہڑتال کر کے بیٹھ جائے۔ کمینے نذیر حسین کی داڑھی نوچ ڈالے یا تلوار کے ایک ہی وار سے اس کی گردن علیحدہ کر دے مگر اسے ایک لمحے کے لئے بھی یہ نہ بھول سکا کہ وہ محض ان کی کرایہ دار تھی۔ مکان اچھا اور سستا ملا ہوا تھا اور بے گھر ہونے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا' اس لئے جلتی بھنتی' مصلحتوں کی چادر اوڑھ کر دوبارہ سونے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔

نگہت کا شوہر فیاض تو باقاعدہ خراٹے لے رہا تھا۔ نگہت کو اپنے سوتے ہوئے شوہر پر بے اختیار پیار آنے لگا۔ کتنا اچھا تھا وہ' مارنا تو کجا اسے کبھی ڈانٹا تک نہیں تھا۔

ان دونوں کی جوڑی کو محلے والے ایک عجیب و غریب جوڑی سمجھا کرتے تھے۔ نگہت ایم اے پاس تھی اور نوکری بھی کرتی تھی جو ان کے نزدیک کافی معیوب بات تھی۔ یہ بھی سننے میں آیا تھا کہ اس کا شوہر فیاض گھر کے کام کاج میں صرف ہاتھ ہی نہیں بٹاتا کرتا تھا بلکہ ہنڈیا تک پکا لیا کرتا تھا۔ جو دفتر سے جلدی آ جاتا کھانا بنا لیتا۔ اس سسٹم کی کسی کو سمجھ نہ آتی تھی چاروں طرف چہ میگوئیاں ہوا کرتیں۔ تبصرے کئے جاتے مگر نگہت اور اس کے شوہر فیاض کو تو گویا کوئی پرواہ ہی نہیں تھی۔ کسی کو خاطر میں ہی نہیں لاتے تھے۔

محلے والیاں بھی نگہت کے خلاف ایک تعصب سا دل میں رکھتی تھیں' جب دیکھو' عورتوں کے حقوق' آزادی نسواں اور کم بچے پیدا کرنے کا پرچار کیا کرتی۔ عجیب الٹے دماغ کی لڑکی تھی وہ۔

نیچے سے آوازیں آنا ابھی تک بند نہیں ہوئی تھیں۔ نگہت سے رہا نہ گیا۔ بستر سے باہر نکل آئی۔ سیڑھیوں کا دروازہ دھیرے سے کھول کر ایک باریک سی درز سے نیچے جھانکنے لگی۔ نیچے کا منظر دیکھ کر اس کے رونگٹے ہی تو کھڑے ہو گئے۔ نذیر حسین صاحب زمین پر گری سلمٰی کو ٹھوکریں مار رہے تھے اور چیخ رہے تھے۔

''اپنی منحوس صورت لے کر یہاں سے دفعان کیوں نہیں ہو جاتی؟ نہ جانے کس منحوس گھڑی تیری شکل میرے نصیبوں میں لکھی گئی تھی۔''

سلمٰی معافیاں مانگ رہی تھی۔ ''آج معاف کر دیں آئندہ ایسی غلطی دوبارہ کبھی نہیں کروں گی۔ نہ جانے کس طرح میری آنکھ نہ کھلی۔ آپ آزما لیجئے گا۔ اب سے ساری رات دروازے کے پاس ہی رہا کروں گی مگر کنڈی دیر سے نہ کھولوں گی میرے سر کے سائیں مجھے معاف کر دیں۔ میں آپ کی باندی ہوں۔''

''بے حیا! چونڈا سفید ہو گیا مگر یوں پڑی سوتی رہتی ہے جس طرح جوانی کی بدمست نیند ہو۔ غیر ذمہ داریاں اور لاپرواہیاں نہ

گئیں تیری۔ مفت کی کھاتی ہے۔ اتنا نہیں کہ میاں گھر آئے تو دروازے پر اسے گھنٹوں کھڑا نہ رکھے تیز تو تجھے چھو کر بھی نہیں گزری۔"

سلمیٰ مسلسل پاؤں پکڑے رہی مگر نذیر صاحب تو گویا برف کی سل بنے ہوئے تھے۔

"ہائے اب بس بھی کر دیں باجی کی غلطی معاف کر دیں۔ دیکھیں نا میری آنکھ بھی کھل گئی ہے میں تو آپ کے قدموں کی چاپ سننے کے لئے کب سے منتظر تھی۔ اب اندر آ بھی جائیں میں کھڑے کھڑے تھک گئی ہوں۔" نجمہ بھی اندر سے بال آخر اٹھ کر باہر آ ہی گئی تھی۔ وہ چاہتی تھی قصہ ختم ہو نذیر صاحب اندر آئیں آ کر کام نپٹائیں تا کہ وہ دوبارہ سو سکے۔ اسے اپنی نیند بہت عزیز تھی۔

نذیر صاحب نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ نجمہ اپنے بھرے بھرے جسم سمیت مدھ بھری آنکھوں میں نینداور طلب کا خمار لئے اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑی توبہ شکن انگڑائیاں لے رہی تھی۔

برف کی سل گرم ہوا کے جھونکے کے سینک سے پگھلنے لگی۔ پٹائی کرنے کا سارا مزا جاتا رہا۔ ان کے ہاتھ بے جان' شل ہو کر ان کے پہلو میں گر گئے۔ چہرہ تھکا تھکا دکھائی دینے لگا مگر جسم میں ایک نئی عجیب وغریب' طاقت اور تازگی سی آتی انہوں نے محسوس کی۔ وہ سلمیٰ کو ایک آخری ٹھوکر لگاتے ہوئے نجمہ کے کمرے کی طرف چل دیے۔

اگلی صبح جمعہ کی چھٹی تھی۔ نگہت دن چڑھے تک سوتی رہی۔ تقریباً ساڑھے گیارہ بجے اس کی آنکھ کھلی۔ فیاض گھر میں موجود نہیں تھا۔ غالباً سودا سلف لینے بازار جا چکا تھا۔ وہ کسلمندی سے کچھ دیر بستر ہی میں پڑی کروٹیں لیتی رہی۔ رات کے پچھلے پہر کا واقعہ اس کی آنکھوں کے آگے فلم کے سین کی طرح گھومنے لگا اور اس کی طبیعت کو مکدر کر گیا۔ حلق میں کڑواہٹ سی گھل گئی۔

نہانے کے لئے غسل خانے کا رخ کیا تو یہ دیکھ کر اسے بہت کوفت ہوئی کہ پانی آنا بند ہو چکا تھا۔ بالٹی والا پانی شاید فیاض استعمال کر چکا تھا۔ نیچے کے صحن میں لگے نلکے میں پھر بھی پانی آ ہی جایا کرتا تھا' صرف اوپر چڑھنے کا ہی ایک خاص وقت تھا' اس لئے چاروناچار نگہت نے بالٹی تھام کر نیچے جانے کے ارادے سے دروازہ دھیرے سے کھولا مگر اس کے قدم وہیں جمے کے جمے رہ گئے۔

نیچے والے سردیوں کی نرم نرم دھوپ میں بیٹھے اپنے اپنے کام کاج کر رہے تھے۔ بڑی اماں تخت پوش پر بیٹھی کوئی پرانا سویٹر ادھیڑ رہی تھیں اور نجمہ اپنے ایک نئے دوپٹے کو بیل سے سجا رہی تھی۔ اس کا منہ چیونگم کھانے کی وجہ سے مسلسل ہلے جا رہا تھا۔ اس نے اپنے گیلے بال سکھانے کے لئے ان کے نیچے اپنے کندھوں پر ایک بدرنگ سا تولیہ ڈال رکھا تھا۔ بچے شاید گلی میں کھیل رہے تھے

کیونکہ گلی سے ہر قسم کا شور آتا سنائی دے رہا تھا۔

سلمٰی مٹی کے تیل کے چولہے پر رکھی ہنڈیا کو تیز تیز ہاتھ چلا کر بھون رہی تھی۔ کبھی پانی کا چھینٹا دیتی کبھی گرم مصالحہ ڈال کر چکھتی نظر آ رہی تھی۔ مصالحے اور گوشت کی ملی جلی اشتہا انگیز خوشبو چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ رات کے واقعے کا اس پر کوئی اثر باقی رہتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

یکا یک نذیر صاحب اندر سے برآمد ہوئے۔ انہوں نے صاف ستھرا دھلا دھلایا استری شدہ جوڑا پہن رکھا تھا۔ بال آراستہ اور چہرہ مطمئن اور ہشاش بشاش نظر آتا تھا جیسے بھرپور نیند سے سو کر اٹھے ہوں۔

''اچھا! میں جا رہا ہوں'' انہوں نے مختصراً سب کو اطلاع دی۔

اماں نے پل بھر کو نظر اٹھائی اور خاموشی سے بیٹے کو دیکھنے لگی۔ نجمہ نے لاڈ سے تھوڑا سا منہ پھلا لیا اور لپک کر کھڑی ہوگئی۔

سلمٰی تیر کی طرح پیڑھی پر سے اٹھی اور نذیر صاحب کا بازو پیار سے تھام لیا۔ ''ہائے اللہ ابھی تو نہ جائیں کھانا کھا کر جائیں۔ دیکھیں نا میں نے آپ کی پسندیدہ چیز کلیجی پکائی ہے۔ بس پانچ دس منٹ میں تیار ہو جائے گی۔ ذرا دھنیا کاٹ لوں۔

''مجھے نہیں کھانی کلیجی ولیجی' مجھے دیر ہو رہی ہے' چلو ہٹو پیچھے۔'' انہوں نے اپنا بازو اس سے سختی سے چھڑوا لیا۔

''کھا لیجئے نا' باہر سے نہ جانے کیا الا بلا کھائیں گے۔ پیٹ خراب ہو جائے گا میں نے تو آپ کی پسند کے مطابق پکائی ہے کلیجی۔''

وہ بدستور مسکرا مسکرا کر انہیں کھانے کے لئے رضامند کرنے کی کوشش کئے جا رہی تھی۔

''کہہ جو دیا نا' نہیں ہے میرے پاس ٹائم تیرا کلیجہ کھانے کے لئے؟ رکھ چھوڑ نا پھر کھا لوں گا۔''

''لیکن اب آپ نہ جانے کب آئیں' جو مزا تازہ کلیجی کا ہوتا ہے وہ تو جاتا رہے گا باسی سالن کھائیں آپ کے دشمن۔''

''زیادہ چونچلے نہ کر' آرام سے بیٹھ' جان کو آ جاتی ہے۔'' انہوں نے اسے تقریباً دھکیلتے ہوئے کہا۔

''کھا لیں نا جی' ورنہ سلمٰی کا دل ٹوٹ جائے گا۔'' نجمہ نے ہلکی سی طنز بھری مسکراہٹ سے کہا۔

''نجمہ تمہیں پتہ ہے وہاں لاری تیار کھڑی ہوگی ہم نے شیخوپورہ جانا ہے سب لوگ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ میں اور نہیں رک سکتا۔ یہ تو سمجھتی ہی نہیں۔''

نجمہ سے بات کرتے ہوئے ان کے لہجے میں میٹھی سے گھلاوٹ آ گئی۔ تھوہر کا پودا گلاب کی ڈنڈی کے بوسے لینے لگا۔

اماں اپنے سینے پرونے میں مصروف ہیں انہوں نے کبھی بیٹے بہو کے معاملوں میں دخل دینا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

''اچھا چلیں! نہ کھائیں کلیجی' آپ ناراض نہ ہوں۔ میں آپ کو پریشان تو نہیں کر سکتی نا۔ خدانخواستہ بلڈ پریشر ہی نہ بڑھ جائے۔ گولی لا دوں آپ کو؟''

''نہیں چاہیے مجھے گولی وولی۔ جان چھوڑ دے میری بس۔''

نذیر صاحب نے زہریلے لہجے میں اسے ڈانٹا اور اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ٹوپی سر پر رکھی اور پھنکارتے ہوئے باہر چلے گئے۔

نگہت دھیرے دھیرے نیچے اتر آئی۔ بالٹی نلکے کے نیچے رکھ دی۔ پانی نیچے بھی قطرہ قطرہ ہی آ رہا تھا۔ وہ دو گھڑی کو اماں کے پاس تخت پوش پر ہی بیٹھ گئی۔ سلام دعا کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اماں دودھ والے کے ناغوں کی وجہ سے سخت پریشان تھیں۔ اس کی بدخوئیاں کرتی چلی گئیں۔

سلمٰی اب رات کے گندے برتنوں کا ڈھیر جمع کر کے انہیں مانجھنے کے لئے راکھ اور صابن لے کر بیٹھ گئی تھی۔

''اماں جی! ایک بات پوچھوں'' نگہت سے رہا نہ گیا چپکے چپکے اماں سے بات کرنے لگی۔

''کیا؟'' اماں نے اون کا گولہ لپیٹتے ہوئے پوچھا۔

''اماں! یہ نذیر حسین صاحب' سلمٰی باجی کے ساتھ اتنی بری طرح کیوں پیش آتے ہیں آخر؟ اتنی تو اچھی ہیں وہ۔ بالکل اللہ میاں کی گائے جیسی۔''

اس نے جھجکتے ہوئے سلمٰی کی طرف دیکھا مگر وہ برتن مانجھنے میں بری طرح مصروف تھی۔ اماں کچھ دیر سوچتی رہی' پھر بولی۔

''بیٹا کیا بتاؤں' اتنی سیدھی ہے خدمت گزار ہے اچھی ہے۔ سب جانتا ہے لیکن کہتا ہے اسے وہ اچھی نہیں لگتی۔ لو بھلا یہ بتاؤ یہ بھی کوئی وجہ ہے مار پیٹ یا جھگڑا کرنے کی' لیکن کرموں جلی جس دن سے اس گھر میں بیاہ کر آئی ہے' نذیر کو اللہ ماری اچھی ہی نہیں لگی۔ شروع شروع میں ہم نے بہت سمجھایا بجھایا مگر اب اللہ کی رضا سمجھ کر چپ ہو رہتے ہیں۔''

نگہت کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ بس ٹکر ٹکر سلمٰی کو دیکھتی چلی گئی۔ یکدم کنڈا کھٹکا۔ نجمہ لپک کر اٹھی اور بڑھ کر جلدی سے دروازہ کھول دیا۔

''میں اپنی گھڑی بھول گیا تھا۔'' نذیر صاحب تیز تیز قدموں سے اپنے کمرے کی طرف چل دیئے اور نجمہ بھی ان کے ساتھ

اندر کو چل دی۔

''کلیجی پک کر تیار ہو گئی ہے دھنیا بھی ڈال دیا ہے میں نے ،اب تو کھالیں نا۔'' سلمیٰ پھر شیرے کی طرح بہنے لگی۔نذیر صاحب نے بس اسے ایک قہر آلود نظر سے نوازنا ہی مناسب سمجھا اور بغیر جواب دیے گھر سے باہر چلے گئے۔

نگہت سے رہا نہ گیا۔گندے برتنوں کے ڈھیر کے آگے بیٹھی سلمیٰ کے پاس جا کر زمین پر چوکی بچھا کر بیٹھ گئی۔

''سلمیٰ باجی معاف کیجیے گا مگر میں آپ کو ہرگز نہیں سمجھ سکتی۔انہوں نے رات آپ کے ساتھ اتنا توہین آمیز سلوک کیا اور آپ انہیں کلیجی پکا کر کھلانے کے لیے یوں مری جا رہی ہیں۔کس طرح کی عورت ہیں آپ؟قسم سے میں آپ کی جگہ ہوتی تو سنکھیا پکا کر کھلا دیتی مردود کو۔'' وہ دانت پیسنے لگی۔اس کا چہرہ تمتمانے لگا' غصے سے نتھنے پھولنے لگے۔

''ارے نہیں پگلی' ایسے نہیں کہتے۔'' سلمیٰ مسکرا دی۔

''آپ کو غصہ نہیں آتا ان کے رویے پر' کس مٹی کی بنی ہیں آپ آخر؟ کیوں اتنے ناز اٹھاتی ہیں ان کے؟''

سلمیٰ مزید ہنسے چلی گئی۔

''تو نہیں سمجھے گی ابھی تو بچی ہے تو کیا جانے ان کی خدمت کر کے مجھے کتنی راحت' کتنا سکون ملتا ہے' میرے لیے کیا یہ کم اعزاز کی بات ہے کہ میں ان کی بیوی کہلاتی ہوں وہ میرے ہاتھ کا پکا کھاتے ہیں' میرے دھلے ہوئے کپڑے پہنتے ہیں' خوش نصیبی ہے میری۔''

''مگر وہ۔۔۔۔۔۔آپ کی قدر نہیں کرتے۔''

''دیکھو بھئی جو کسی کا دل چاہے وہ کرے۔اب اگر ان کا دل چاہتا ہے مجھے ماریں' مجھے گالیاں دیں تو ان کی مرضی' ان کی خوشی' جو میرا جی چاہتا ہے میں بھی تو کر ہی لیتی ہوں۔''

''یعنی؟''

''بھئی! ان کی سیوا! دیکھو نگو بی بی! سیدھی سی بات ہے ہم تو مجبور ہیں۔''

''کیا مجبوری ہے آپ کی؟ یہی نا کہ دو بول پڑھوا بیٹھی ہو اس کے ساتھ؟''

نگہت کے کچھ پلے نہیں پڑ رہا تھا۔

''جانِ من! ہم دل کے ہاتھوں مجبور ہیں بس اور کوئی بات نہیں۔''

سلمیٰ آپا پندرہ سولہ سالہ لڑکی کی طرح لجانے لگیں۔ ان کے چہرے پر بیک وقت کئی رنگوں کی شفق کے سائے سے منڈلانے لگے۔ آنکھیں شرابی سی ہوگئیں۔ آنکھوں کا کجرا بھیگنے لگا۔

''دل کے ہاتھوں؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''

''کیا کروں بس مجھے وہ بہت اچھے لگتے ہیں نا! اور کوئی وجہ نہیں۔'' سلمیٰ کی پلکیں بچے جذبوں کے موتی اپنے اندر سمونے کی ناکام کوشش میں ساری کی ساری نیچے کو جھک آئیں۔



جڑیں

''پروگرام بدل گیا! بالکل بدل گیا! اس لیے تیار ہو جاؤ مائی ڈیئر!'' ڈاکٹر موہن شرما نے گھر پہنچتے ہی اپنی بیوی رتنا کو مسکراتے ہوئے اطلاع دی۔

کونسا پروگرام؟ کیسی تیاری؟ رتنا کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولی۔

''بھئی چھٹیوں میں کہیں دور جانے کا پروگرام! اور کیا؟

ہاں تو سپین جانے کا ہی ہم نے پلان کیا تھا نا.... مجھے پتہ ہے.... بھولی تو نہیں!

نہیں مائی ڈیئر! سپین نہیں بلکہ اس سے بھی دور! افق کے اس پار! سمندروں کے دوسری طرف... ستاروں سے آگے!

وہ خلاؤں میں گھور گھور کر دیکھنے لگا۔

کیا مسخری کرتے رہتے ہیں..... بال سفید ہو گئے۔ بچے اپنے اپنے گھروں کے ہو گئے مگر آپ کی طبیعت میں ابھی تک بچپنا باقی ہے!

رتنا نے ہنستے ہوئے پیار سے اس کے چپت لگاتے ہوئے کہا۔

نہیں جانِ من! آئی ایم سیریس' اس بار میں ایک خاص ٹرپ لگانا چاہتا ہوں۔ اپنے ماضی' اپنی جڑوں' اپنے آغاز کی جانب گوئنگ بیک' ٹرپ! دراصل آج ہسپتال میں میرے ساتھی ڈاکٹر فہیم شیخ نے پاکستان کے بارے میں باتیں شروع کر دیں تو میں نے بھی اسے بتا دیا کہ میں بھی گوجرانوالہ کے نواحی قصبہ ایمن آباد کو بی لانگ کرتا ہوں۔ وہ بڑی دلچسپی لینے لگا اور اس سے گفتگو کر کے معلوم ہوا کہ وہ ایمن آباد کے بارے میں بھی خوب جانتا تھا۔ میں نے اس سے خوب سوال جواب کئے اور اس نے بھی تازہ ترین معلومات بہم پہنچائیں۔ اس سے باتیں کر کے بڑا مزا آیا۔ بس ڈیئر دل چاہ رہا ہے جلدی سے واپس جا کر اپنے ہوم ٹاؤن کو پھر سے دیکھوں!

وہ بچوں کی سی معصومیت کے ساتھ بولا۔

اچھا! میں تو سمجھتی تھی آپ کا ہوم ٹاؤن یارک شائر انگلینڈ کا وہ سمال ٹاؤن تھا جہاں آپ کا فارم تھا.... کیا نام تھا اس کا...؟

شاید سویٹ رورSweet River

ہاں!SweeT River میں بھی ہم رہتے تھے لیکن اس سے پہلے تو ایمن آباد سے ہم نے ہجرت کی تھی نا!

''بڑا'' زنگ ہے آپ کا ماضی تو... اچھا میں تو سونے لگی ہوں! پھر بات کریں گے صبح... رتنا نے جمائیاں لیتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں۔

دراصل وہ تو پیدائشی امریکی تھی اور اس نے تمام زندگی امریکہ ہی میں گزاری تھی اسے دور پار کے ملکوں اور کلچرز اور تاریخ ساز رومانویت سے کوئی اتنی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ اس کا شوہر البتہ مسکڈ بریڈMixed Breed اور مکس تہذیبوں کا پروردہ انڈین تھا۔ یا شاید انڈین تھا بھی کہ نہیں۔ رتنا نے اس پر اب اتنا بھی غور نہیں کیا تھا کیونکہ اب تو وہ بھی امریکی شہریت کا حامل تھا۔ اس نے چند لمحے موہن کی باتوں پر غور کیا اور پھر کروٹ بدل کر سو گئی۔ مگر موہن کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ اس کا دل اور دماغ مکمل طور پر بیدار ہو چکے تھے اس لیے اب اسے اتنی جلدی نیند کس طرح آ سکتی تھی۔ اور تقسیم ہونے تک وہ اور اس کا خاندان ایمن آباد میں ہی رہا کرتے تھے۔ اس وقت اس کی عمر بمشکل آٹھ دس سال رہی ہوگی۔

اس کا باپ ہندو اور ماں انگریز تھی۔

باپو کی پہلی بیوی ایک لڑکے کو جنم دے کر خود رخصت ہو چکی تھیں۔ انہوں نے لنڈا کو اپنے بیٹے جگن کو انگریزی پڑھانے کے لیے ٹیوٹر رکھا ہوا تھا۔ لنڈا کی جگن سے بے پناہ محبت اور خلوص دیکھ کر باپو کے دل میں لنڈا کے لیے ایک نرم گوشہ پیدا ہو گیا تھا۔ باپو نے جب لنڈا کی طرف اپنائیت کا ہاتھ بڑھایا تو اس نے جھٹکا نہیں بلکہ پیار سے تھام لیا اور یوں وہ دونوں رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔

لنڈا اپنے شوہر امیت شرما کے لیے ایک بہت اچھی بیوی اور گھر ہستن ثابت ہوئی۔ اس نے اپنے آپ کو ایک مکمل مشرقی ناری کے روپ میں ڈھال لیا اور انگریزوں والے طور طریقے چھوڑ دیے جس سے اس کا خاندان بہت ناراض ہوا مگر لنڈا نے اس بات کی کوئی پرواہ نہ کی۔ لنڈا کا باپ فوج میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھا اور انہوں نے دستور کے مطابق لنڈا کو پیدائشی انڈین ہونے کے باوجود انگلستان میں تعلیم دلوائی تھی۔ ان کا خیال تھا ان کی بیٹی ان کی توقع کے مطابق کسی فوجی افسر کی بیوی بنے گی لیکن لنڈا نے ایک ہندو کپڑے کے بیوپاری سے شادی کر کے انہیں سخت الجھن میں ڈال دیا تھا۔

شادی کے ایک سال بعد لنڈا نے موہن کو جنم دیا۔ نیلی آنکھوں گوری رنگت اور کالے بالوں والا موہن اتنا پیارا بچہ تھا کہ لوگ اسے گود میں اٹھا کر چچ پچ کئے بنا رہ نہ سکتے تھے۔ شکل وصورت سے وہ نسبتاً انگریز ہی لگتا تھا لیکن عادتیں اس کی اور اس کے سوتیلے بھائی جگن کی ایک جیسی تھیں۔

دونوں بچوں کو لنڈا نے گوجرانوالہ کے ایک مشن سکول میں داخل کروادیا تھا اور گھر پر بھی انہیں انگریزی تعلیم اور ایٹی کیٹ کے سبق بھی دیتی رہتی تھی۔

سکول سے زیادہ موہن کا دل اپنے گھر میں لگتا تھا۔ اور گھر سے زیادہ اپنے گھر کے پچھواڑے پھیلے ہوئے وسیع وعریض پھلوں کے باغ میں جہاں وہ اور اس کا بھائی جگن ساری دوپہر کھیل کود کر گزارا کرتے تھے۔ ان کا گھر ایک پرانی وضع کی پرشکوہ حویلی تھا۔ جس کا خاص پھلوں کا باغ اسے پورے علاقے میں ایک شان ایک منفرد مقام عطا کئے ہوئے تھا۔ لوگ اسے اچی حویلی کہہ کر پکارا کرتے تھے کیونکہ وہ کچھ اونچائی پر تعمیر کی گئی تھی۔ ان کی حویلی اور باغوں کے آگے بھی بارش کا پانی نہیں ٹھہرتا تھا اس لیے وہ ہمیشہ صاف ستھری اور شاہانہ سی دکھائی دیتی تھی۔

باغ میں دور دور سے منگوائے گئے خاص بیجوں سے اگائے ہوئے پھلوں کے درخت تھے۔ جس پھل کا موسم آتا درخت خوشی خوشی اس پھل کا زیور بن کر لدے پھندے نظر آنے لگتے اور ہوائیں ناچ ناچ کر پتوں کا منہ چومنے لگتیں۔ موہن اور جگن نوکروں اور دوسرے محلے کے دوست لڑکوں کے ساتھ مل کر ساری دوپہر باغ میں ہنگامہ بپا رکھتے۔ غلیلوں سے چڑیوں کا شکار کرتے اور شام پڑتے ہی درختوں کے پیچھے لک چھپ کر آنکھ مچولی کھیلنے لگ جاتے۔

موہن کو حویلی کا سارا نقشہ اب بھی تقریباً یاد تھا لیکن اس کی پرچھائیاں کچھ دھندلی ضرور ہوگئیں تھیں۔ حویلی میں نہ جانے کتنے کمرے تھے موہن نے کبھی گنے نہیں تھے لیکن اس کا اپنا ایک چھوٹا سا کمرہ جو شاید کمرہ بھی نہیں ایک گوشہ کہلایا جا سکتا تھا موہن کو کبھی نہیں بھولا تھا۔ وہ کمرہ اس کا دوست اس کا ساتھی اس کا ہائیڈ آؤٹ تھا۔ جہاں وہ جب جی چاہتا چپکے سے جا گھستا اور دنیا جہان سے علیحدہ اپنی ہی ایک دنیا میں سانس لینے لگتا۔ وہاں وہ گرمیوں کی لمبی دوپہروں میں کتابیں پڑھ کر یا کبھی کھڑکی سے باہر اڑتے پرندوں کو دیکھ دیکھ کر وقت گزارا کرتا تھا۔ کبھی کبھار اس کے چچازاد بھائی بہن آجاتے تو وہ لوگ بھی اس ننھے منے سے کمرے میں آگھستے خوب گپیں لگتیں۔ سب مل کر کبھی لڈو اور کبھی کیرم بورڈ کھیلتے اور کبھی خوامخواہ کا ہلڑ مچائے رکھتے۔

اس کی ماما کو بھی موہن کے اس گوشے کا اچھی طرح پتہ تھا۔ اس نے اس کا نام Mohan's Nest رکھ چھوڑا تھا۔ موہن

جب سارے گھر میں یا باغ میں نہ ملتا تو انہیں پتہ چل جاتا کہ موہن اپنے مخصوص گوشے میں چھپا' دنیا جہان بھلائے بیٹھا ہوگا۔

حویلی کے دوسرے کمروں میں اس کی دادی' دادا' چاچا کا خاندان اور نوکر چاکر بھی رہتے تھے۔ سارا گھر دادی اماں کے ہاتھ کے بنے خالص گھی کے پراٹھوں اور محبت کی مہک سے ہروقت خوشبودار رہتا۔

ماما کے ساتھ لیٹ کر باتیں کرنے میں بھی اسے بہت لطف آتا۔ ماما کی خواہش تھی کہ ایک دو سال میں اسے تعلیم کے لیے انگلستان روانہ کردیا جائے۔ ان دنوں انگریز اپنے بچوں کو اسی طرح وت آنے پر سکولنگ کے لیے اپنے ملک بھیج دیا کرتے تھے' مگر موہن کو اس بات میں کوئی تک نہ نظر آتی۔ بھلا اپنا پیارا سا گھر' ماں باپ' رشتہ دار چھوڑ کر دوسرے ملک جانے کو کس کافر کا دل چاہ سکتا ہے۔ اسے تو یونہی اپنے باغ میں کھیلنے' اپنے کمرے میں گھسے رہنے اور ماما سے انگلینڈ کے قصے کہانیاں سن لینے سے ہی اپنی زندگی بھرپور اور مکمل لگا کرتی تھی۔ بھلا اس میں اور کسی بات کی گنجائش کہاں رہ جاتی تھی۔

زندگی اچھی بھلی گزر رہی تھی کہ ملک تقسیم ہوگیا۔

موہن کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ تقسیم کیا ہوتی ہے۔ انہیں اپنا گھر' اپنا باغ' اپنی حویلی چھوڑ کر کہیں اور کیوں جانا پڑ رہا تھا؟ لوگ قتل کیوں ہو رہے تھے؟ وہ اپنے دوست رحیم علی کے گھر اب کھیلنے کیوں نہیں جاسکتا تھا اور رحیم علی اب اس کے گھر کیوں نہیں آسکتا تھا۔ سب لوگ خوف کی زنجیروں میں ہمہ وقت جکڑے' تفکرات اور ایک لایقین مستقبل کے اندیشوں کا بوجھ اپنی اپنی کمروں پر لادے' بس چلے جا رہے تھے چلے جا رہے تھے۔

موہن بیٹا ہم کچھ عرصے کے لیے اپنا گھر چھوڑ کر کہیں اور جا رہے ہیں' جلد ہی واپس آجائیں گے!

اس کی ماما نے جب اسے یہ خبر سنائی تو وہ اپنے ننھے منھے Nest میں خاموش بیٹھا جا بجا پلستر اکھڑی دیواروں کو بلا مقصد تکے چلا جا رہا۔ جب ان سب نے حویلی اور باغ چھوڑا تو بارش چھم چھم رو رہی تھی۔ پھلوں کے درختوں کے پتے آنسو بن کر ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے۔ طوطے احتجاجاً ٹیں ٹیں کرکے شور مچانے لگے اور سارے باغ میں ایک ہنگامہ سا برپا ہوگیا۔

گھر کا کچھ ضروری سامان بیل گاڑیوں' تانگوں میں لاد کر حویلی کو اسی طرح بھرا ہوا' سجا سجایا چھوڑ کر موہن اور اس کے گھر والے ایمن آباد کو چھوڑ کر سرحد پار' ہندوستان کی طرف چل دیئے۔ دہلی آکر انہوں نے نئے سرے سے اپنی زندگی شروع کی اور باپو نے اپنا کاروبار کسی حد تک دوبارہ جما لیا مگر اپنی جنم بھومی چھوڑنے کا ان سب کو بہت دکھ رہا۔ دھیرے دھیرے انہوں نے نئے ملک' نئے شہر میں قدم جمانے شروع کردیئے' مگر ماما کچھ زیادہ ہی اکھڑی سی گئی تھیں۔ ماما کے اور ان کے رشتہ داروں کے بے حد اصرار پر

امیت شرما اپنے خاندان سمیت انگلستان ہجرت کرنے پر رضامند ہو گئے۔ چاچا کا خاندان اور دادی دادا نے البتہ ہندوستان میں ہی ٹھہرے رہنا پسند کیا۔

موہن اس وقت تک تقریباً پندرہ سولہ برس کا ہو چکا تھا۔ پچھلے چار پانچ سالوں میں ہی اس کی زندگی میں اتنی تبدیلیاں آ چکی تھیں کہ اس کی طبیعت میں کھلنڈرے پن کے بجائے ایک گہری سنجیدگی آ چکی تھی۔

انگریزی تہذیب اس کے لیے انوکھی اور نئی تو ہرگز نہیں تھی کیونکہ برطانوی نژاد ماں ہونے کی وجہ سے اسے کچھ کچھ ہر بات کا پہلے سے پتہ تھا۔ مگر ہندوستان میں رہنے کی وجہ سے اس میں کچھ کچھ مشرقیت باقی تھی۔

شروع شروع میں انہیں لندن شہر کے ایک نسبتاً سستے علاقے کے ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہنا پڑا' پھر ماما اور باپو نے عقلمندی سے کام لیتے ہوئے اپنا ایک ذاتی گروسری سٹور کھول لیا تو پیسے کی تنگی کافی حد تک دور ہونا شروع ہو گئی۔

انہوں نے لندن کا فلیٹ چھوڑ کر ایک مضافاتی قصبے Sweet River میں ایک فارم ہاؤس خرید لیا اور خوشی خوشی وہاں شفٹ ہو گئے۔ یہ گھر بھی ایمن آباد کے گھر سے کچھ چھوٹا نہیں تھا۔ البتہ اس طرح کے پھلوں کے باغ اس کے پچھواڑے نہیں تھے۔

فارم ہاؤس کے آگے پیچھے کئی ایکڑ کھلی زمین' کھیت اور ملبری کے درخت تھے اور مکان کی دائیں بغل میں جانوروں کو رکھنے' باندھنے کے لیے' ایک بڑا سا بارن بھی تھا۔ جس میں ایک اصطبل بھی موجود تھا۔

موسم زیادہ تر ٹھنڈا اور گیلا رہتا مگر پھر بھی موہن اور اس کا بھائی' باپو کے ہمراہ اکثر گھڑسواری کے لیے میلوں دور نکل جاتے راستے میں وہ کبھی کبھار ستانے کے لیے جنگل میں رک جاتے تو باپو حسرت سے چاروں طرف سبزے کی خوبصورتی دیکھ کر کہتا۔

''اب تو یہ میرا گاؤں ہے پر یہ میرا گاؤں نہیں! کتنی ٹھنڈ ہے یہاں! ان درختوں پر تو ساون کے جھولے بھی نہیں پڑ سکتے!''

دونوں لڑکے ہنسنے لگ جاتے اور باپو کا دھیان بٹانے کے لیے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگتے۔ گھر پہنچتے ہی باپو آتشدان میں آگ سلگا لیتے اور موہن اپنے کمرے کی طرف چل دیتا۔

فارم ہاؤس لکڑی اور اینٹوں کا بنا ہوا پرانا سا بڑا سا ایک مکان تھا جس میں زیادہ تر بیڈروم اوپر تھے۔ نیچے کچن اور ایک بڑا سا ہال نما کمرہ تھا جسے وہ سب بیٹھک کے طور پر استعمال کیا کرتے تھے۔

پرانے زمانے کے گھروں کی طرح اس گھر میں بھی ایک Attic تھا۔ یہ Attic بیڈرومز اور مکان کی چھت کے درمیان میں ایک سٹوریج کے طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا مگر اس میں پہلے سے ہی اتنا کاٹھ کباڑ جمع تھا کہ باپو اور ماما نے اسے صاف کرنے اور

اپنے لیے قابل استعمال بنانے کی کبھی کوشش ہی نہیں تھی۔ اٹیک میں جانے کے لیے ایک تنگ سی لکڑی کی سیڑھی اس طرح سے اس سے لٹکتی رہتی تھی کہ وقت پڑنے پر اسے فولڈ بھی کیا جا سکتا تھا۔

موہن کو اس Attic میں ہمیشہ سے بہت دلچسپی رہی تھی اس انگلستانی گھر میں یہ Attic اس کا ہائیڈ آؤٹ تھا جہاں وہ گھنٹوں اوپر گھسا اپنے ساتھ وقت گزارا کرتا تھا۔

اس Attic میں جہاں کئی قسم کا پرانا فرنیچر' رسالے' کھلونے اور دیگر اشیاء پڑی ہوئی تھیں وہیں ایک دیوار پر لگی ایک ادھوری پینٹنگ بھی موجود تھی جس کے بارے میں موہن کا تجسس کبھی ختم نہیں ہو سکا تھا۔

پینٹنگ کسی لڑکی کی تھی جس کا نام غالباً شیلی تھا کیونکہ پینٹنگ کے ماتھے پر یہی لکھا ہوا تھا۔ ''شیلی''

شیلی نیلی آنکھوں' سنہرے بالوں اور پتلے نقش و نگار کی مالک ایک نوجوان لڑکی دکھتی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک معصوم سی مسکراہٹ ہمہ وقت کھیلتی نظر آتی تھی۔ آرٹسٹ نہ جانے کون تھا اور تصویر مکمل کیوں نہیں کر پایا تھا کیونکہ ابھی تک کچھ سوکھے رنگوں کے ڈبے اور برش ادھر ادھر پھیلے پڑے تھے۔ تصویر کا صرف چہرہ ہی مکمل ہو سکا تھا باقی کینوس پر صرف سکیچنگ کی گئی تھی۔ موہن اور شیلی میں دوستی ہو گئی۔ موہن اکثر اس سے باتیں کرتا اور پوچھتا کہ وہ ادھوری اور اکیلی کیونکر رہ گئی ہے؟ وہ کون ہے؟ کہاں چلی گئی ہے؟ مگر شیلی تو غالباً ہٹ دھرمی کو اپنا شعار بنا چکی تھی اس لیے اس کی باتوں کا سوائے ایک مسکراہٹ کے کبھی کوئی معقول جواب نہ دیتی اور وہ جھنجھلا کر رہ جاتا۔

دونوں کی دوستی میں وقت گزرنے کا پتہ بھی نہیں چلا اور موہن تعلیم کی منزلیں طے کرتا کرتا ڈاکٹر بن گیا۔

جس روز اس نے ڈاکٹر بن جانے کے بعد اپنے ماں باپ اور بھائی سمیت امریکہ ہجرت کر جانے کے بارے میں شیلی کو بتایا تو شیلی یکدم دوبارہ ایک بے جان' منجمد پینٹنگ بن گئی۔ جھٹ سے جا کر اپنے فریم میں یوں فکس ہو گئی کہ گمان ہونے لگا کہ جیسے وہ اسے کے علاوہ کبھی بھی کچھ اور نہ تھی۔ ایک ادھوری' گمنام' بے جان سی پینٹنگ' محض ایک تصویر۔

مگر تمہارے یہ خشک رنگ اچانک گیلے سے ہو کر باہر کیونکر بہہ نکلے ہیں؟'' موہن نے اس کی اداس آنکھوں کے کونے پر آئے ہوئے پانی کے قطرے کو دھیرے سے پونچھتے ہوئے سوال کیا۔ رنگ مزید بہہ چلے گئے اور شیلی پھر ہٹ دھرمی پر اتر آئی اور اس کی کسی بات کا پہلے کی طرح اسے کوئی جواب نہیں دیا۔

چھ سال اس انگلش کنٹری سائیڈ کے بڑے سے فارم ہاؤس میں گزارنے کے بعد ایک بار پھر امیت شرما اپنے بیوی بچوں کی انگلی

تھامے اللہ کی وسیع سرزمین میں ایک نئے وطن کی تلاش میں روانہ ہوگیا۔فرق اب کے یہ تھا کہ اس باراس کی اوراس کی بوڑھی بیوی کے حوصلے پست اورارادے کمزورہوچکے تھے'ان کی اپنی کوئی مرضی باقی نہ رہی تھی۔

ان کے بچوں کی خوشی ہی ان کی خوشی تھی اوران کے بچوں کی یہی خوشی تھی کہ وہ سب امریکہ جاکررہنے لگیں۔

فارم ہاؤس چھوڑتے ہوئے موہن نے آخری بار اپنے گھر پرنظرڈالی۔سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا کہ ہمیشہ سے تھا کچھ بھی تو تبدیل نہیں ہوا تھا۔

شیلی Attic کی کھڑکی میں دورتک اسے ہاتھ ہلاتی نظرآتی رہی امریکہ پہنچ کروہ سب کچھ سالوں میں بڑی اچھی طرح سیٹ ہو گئے۔موہن اوربڑے بھائی نے شادیاں بھی انڈین کمیونٹی میں ہی کرلیں اورآرام سے زندگی گزارنے لگے۔

باپوشایداتنے لمبے سفر کرتے کرتے تھک گئے تھے اس لیے جلدی ہی رخصت ہوگئے اورماما اکیلاپن محسوس کرنے لگیں۔

بڑے بھیا نیویارک میں امپورٹ ایکسپورٹ کا کام کرنے لگے اورڈاکٹرموہن شرمانے ورجینا سٹیٹ میں اپنی ریڈیالوجی کی پرائیویٹ پریکٹس کھول لی۔

رتنا یعنی موہن کی بیوی ایک کالج میں پروفیسرتھی۔دونوں میاں بیوی بہت مصروف اوربھرپورزندگی گزارتے تھے ان کا ایک بیٹا اورایک بیٹی بھی تھی جن سے وہ دونوں دیوانگی کی حدتک پیارکرتے تھے۔

ڈاکٹرموہن شرمانے وقت کے ساتھ ساتھ دنیامیں سب کچھ حاصل کرلیا تھا۔نام'پہچان'دولت'عزت اورگھریلوسکون'مگرپھربھی جب وہ تھک ہار کے رات کوبستر پرلیٹتا تو اسے اپنی زندگی ایک عجیب وغریب فلم کی طرح اپنی آنکھوں کے سامنے سے گزرتی ہوئی محسوس ہوئی۔

وہ کبھی کبھاررتنا سے بھی اپنی زندگی کے بارے میں بات چیت کرلیا کرتا۔وہ سن تولیتی تھی مگرسمجھتی کچھ نہیں تھی۔کیونکہ وہ پیدا ہی امریکہ میں ہوئی تھی اس کا اپنا کوئی ماضی نہیں تھا البتہ اس کے والدین کوکہانیاں کچھ موہن کی فیملی کی کہانی سے ملتی جلتی تھیں۔

وہ اس کی کہانیاں سن کرہنس پڑتی اوراسے The Far Pavilions کے ہیروآدھے ہندوآدھے انگریز ایشلی اوراشوک کے نام سے چھیڑنے لگتی۔اورکبھی کبھاراس کے بچے بھی اپنے باپ کی ماضی سے رومانی وابستگی کے نفسیاتی تانے بانے کا ہلکے پھلکے اندازمیں مذاق اڑانے لگتے۔وہ بھی پیدائشی امریکن تھے اس لیے انہیں کسی اجنبی تہذیب اورملک سے کیا سروکارہوسکتا تھا۔

جوں جوں ڈاکٹرموہن شرما کی عمر بڑھتی جارہی تھی اسے اپنا ماضی اپنی جڑیں بھولنے کے بجائے زیادہ یاد آنے لگی تھی۔کبھی کبھی

جب وہ سوچتا کہ وہ کون ہے؟ کیا ہے؟ اس کی شناخت کہاں سے شروع اور کہاں ختم ہوئی ہے؟ اس کا ملک اس کی تہذیب اس کا ورثہ کونسا ہے' تو اس کا ذہن بھول بھلیوں میں گم سا ہونے لگا جاتا ماما کے گزر جانے کے بعد سے تو وہ کچھ زیادہ ہی اس طرح سے سوچنے لگا تھا۔

اس روز جب اس کے کولیگ' پاکستانی ڈاکٹر نے' جو گوجرانوالہ سے تعلق رکھتا تھا' اپنے بیک ہوم کے قصے چھیڑے تو موہن کے دل میں ایک عجیب سی امنگ جاگی۔ اس کا دل ایک بار پھر' اپنے بچپن کا گاؤں دیکھنے کو تڑپنے لگا۔ اس نے ڈاکٹر فہیم شیخ سے اپنی خواہش کا ذکر کیا تو اس نے بہت خوشی اور حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر موہن آپ جب جانا چاہیں مجھے بتادیں' میرا بھائی اور اس کی فیملی آپ کے میزبان بننے کے لیے بخوشی رضامند ہو جائیں گے۔ ایسی کیا بات ہے؟ اپنا گھر ہے وہاں۔ آپ ایک دفعہ حامی تو بھریں۔"

موہن نے اپنی بیوی سے ڈاکٹر فہیم شیخ کی اس فراخدلانہ پیش کش کا ذکر کیا تو تھوڑی بہت پس وپیش کے بعد وہ ان کی مہمان نوازی قبول کرنے پر تیار ہوگئی۔

پروگرام یہ بنا کر پہلے وہ پاکستان جائیں گے اور پھر واپسی میں انگلینڈ رکیں گے' کچھ سیر تفریح کریں گے اور موہن سویٹ رور میں اپنا فارم ہاؤس بھی رتنا کو دکھائے گا۔

موہن بچوں کی طرح ایکسائیٹڈ اور خوش تھا بار بار رتنا کو اپنے بچپن اور اوائل جوانی کے واقعات سناتا جنہیں وہ پہلے بھی کئی بار سن چکی ہوتی مگر اس کا دل نہ توڑنے کی وجہ سے پھر بھی سن لیتی۔

ان کی چھٹیاں شروع ہو چکی تھیں۔ انہوں نے پوری کرسمس ہالی ڈیز اپنے اسی دورہ میں گزار دینے کا فیصلہ کر لیا تھا اس لیے وہ پہلے ہی دن اپنے بچوں کی بیسٹ وشز وصول کر کے اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔

ان کا خیال تھا وہ لاہور ایئرپورٹ سے سیدھے کسی ہوٹل میں جائیں گے کچھ دیر ٹھہریں گے پھر ڈاکٹر شیخ کے بھائی سے جو گوجرانوالہ میں رہتا تھا رابطہ قائم کریں گے مگر انہیں یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ ڈاکٹر شیخ کا بھائی افضل انہیں لینے کے لیے خود لاہور ایئرپورٹ پر پہنچا ہوا تھا۔

لیکن آپ نے کیوں تکلیف کی۔ ہم خود ہی آجاتے" آپ کے پاس بھائی صاحب' رتنا نے مہذب انداز میں بات کی۔

کیسی باتیں کرتے ہیں جی آپ لوگ۔ بھائی جان کے آپ دوست ہیں۔ ہمارے مہمان ہیں' بھلا ایسے کیسے ہو سکتا تھا کہ میں

آپ کو ائیر پورٹ ٹیکسی ہوٹلوں کی خواری کے لیے تنہا چھوڑ دوں نہ جی نہ۔ میں خود گاڑی میں آپ کا گھر لے کر جاؤں گا۔!

لیکن ہم نے تو ایمن آباد جانا ہے...

موہن نے دبی دبی زبان میں بتایا۔

تو کیا ہوا؟ بھائی صاحب میں آپ کو خود ایمن آباد تو کیا جہاں کہیں گے لے جاؤں گا۔ ایسی کیا بات ہے؟ بس آپ تو اب فکر ہی نہ کریں۔ "ریلیکس اینڈ انجوائے یور وزٹ !افضل سادگی سے ہنسنے لگا۔ موہن اور رتنا کو اس کے خلوص کے آگے ہتھیار پھینک دینے پڑے اور وہ چپ چپ افضل کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔ شیخ افضل اپنے بھائی ڈاکٹر فہیم کی طرح بہت ہنس مکھ اور بات بات پر مسکرا دینے والا بے فکرا سا انسان لگتا تھا۔ اس کی ساری عمر گوجرانوالہ اور اس کے نواح میں گزاری تھی اس لیے مہمانوں کو اس سے بہتر گائیڈ بھلا کہاں مل سکتا تھا۔ اسے اپنے علاقے کا اچھی طرح سے علم اور ہر بات سے واقفیت تھی۔

گوجرانوالہ پہنچ کر انہوں نے شیخ افضل کے گھر جا کر کچھ دیر آرام کیا۔ اس کے بیوی بچوں سے ملے اور انہیں کچھ امریکن تحائف بھی دیئے۔ میزبانوں نے ان کے لیے ایک صاف ستھرا آرام دہ کمرہ اچھی طرح سیٹ کر کے رکھا ہوا تھا جہاں وہ رات کو بے خبر ہو کر سوئے تو اگلے دن دھوپ چڑھے ان کی آنکھ کھلی۔

نہ نہ کرنے کے باوجود شیخ افضل اور اس کی بیوی سلمٰی نے انہیں زبردستی خالص پنجابی ناشتہ کروایا۔ پراٹھے لسی اور مکھن دیکھ کر رتنا "ٹو ہیوی ٹو ہیوی" کرتی رہ گئی مگر میزبانوں کی دل شکنی نہ کرنے کی وجہ سے کھانے پر رضامند ہو گئی۔ اس نے اپنے ماں باپ کو ایسی چیزیں ایک خاص ٹریٹ کے طور پر ضرور کھاتے دیکھا تھا مگر خود اتنی ہائی کیلوری غذا سے پرہیز کرتی تھی۔

موہن بھائی جی ویسے آپ لگتے نہیں ہیں ہمارے گاؤں ایمن آباد کے! یعنی آپ کا رنگ روپ تو اتنا صاف ہے اور آنکھیں بھی۔ سلمٰی نے بڑی اپنائیت سے تبصرہ کیا۔

دراصل موہن کی ماما برٹش تھیں نا....- رتنا نے وضاحت کی۔

اوہ اچھا پھر تو آپ انگریز ہوئے نا ہائے اللہ جی کتنی عجیب بات ہے۔ سلمٰی دلچسپی سے اسے مزید تکنے چلی گئی۔

ناشتے کے بعد ایمن آباد جانے کا پروگرام بنا۔ افضل اور سلمٰی بھی موہن اور رتنا کے ساتھ اپنی کار میں روانہ ہو گئے۔ راستے میں افضل اور سلمٰی ان سے امریکہ اور اپنے بھائی فہیم کے بال بچوں کے بارے میں سوالات پوچھتے رہے اور موہن اپنے بچپن کے قصے انہیں سنانے لگا۔ سفر بہت مزے سے کٹ رہا تھا۔

موہن زیادہ وقت گاڑی سے باہر نظارہ کرتا رہا۔ جب وہ لوگ ایمن آباد میں داخل ہوئے تو سردیوں کی مزیدار نرم نرم دھوپ ہر طرف پھیل چکی تھی۔ موہن کو شہر میں داخل ہونے کا قطعاً احساس نہیں ہوا کیونکہ سڑک پہلے کی طرح خاموش اور ویران نہیں تھی۔ اب تو سڑک کے چاروں طرف دکانیں' گھر' لوگ چلتے نظر آتے تھے۔ ٹریفک رواں دواں تھی۔ کاریں' موٹر سائیکلیں' تانگے' ویگنیں' ایک بے ہنگم سا شور بپا کیے ہوئے تھیں۔ گندگی اور غلاظتوں کے انبار' مٹھائیوں کی دکانوں پر مکھیاں دیکھ کر مہمانوں کی طبیعت مکدر ہونے لگی مگر جیسے ہی وہ لوگ روڑی صاحب کے علاقے میں داخل ہوئے' خوبصورت سبزہ زار' ہرے بھرے کھیت اور لہلاتے جھومتے درخت دیکھ کر موہن کا چہرہ کھل اٹھا۔ یہاں ہم بچپن میں کئی بار کھیلنے آیا کرتے تھے۔ موہن نے ایک خوبصورت' شاندار' پرشکوہ' عمارت کے آگے کچھ لمحوں کے لیے گاڑی رکوائی اور رتنا کو خوابیدہ انداز میں بتانے لگا۔

افضل نے بھی رنجیت سنگھ کے زمانے کے تعمیر شدہ اس عظیم الشان گردوارے کے بارے میں مزید معلومات بہم پہنچائیں۔

روڑی صاحب دیکھنے کے بعد فہیم شیخ نے اپنی گاڑی کا رخ ''نواں محلہ'' کی طرف موڑ دیا جہاں ''اچی حویلی'' یعنی موہن شرما کے آباؤ اجداد کا گھر ابھی تک اسی نام سے موہن شرما کے آباؤ اجداد کا گھر ابھی تک اسی نام سے موجود اور پکارا جاتا تھا۔

''گلیوں کے اندر کار نہیں جاسکتی اس لیے آگے پیدل چلنا ہوگا۔ افضل کے کہنے پر سب لوگ نیچے اتر آئے۔ میلے کچیلے' پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس بچے انہیں حیرت اور دلچسپی سے تکنے لگے۔

چند تنگ تاریک گلیاں گزرنے کے بعد افضل شیخ ایک عمارت کے آگے جا کر رک گیا۔ رتنا نے سوالیہ انداز میں اپنے شوہر کی جانب دیکھا۔ موہن بھی تذبذب میں گرفتا اس عمارت کو غور سے دیکھنے لگا۔

دس از اٹ؟ رتنا کہہ اٹھی۔

موہن پلکیں جھپک جھپک کر اس ٹوٹے پھوٹے خستہ حال درمیانے سائز کے مکان کو دیکھتا چلا گیا جو تقریباً پینتالیس پچاس سال پہلے اس کا گھر تھا۔

ہماری حویلی تو بہت بڑے سائز کی ہوا کرتی تھی مگر یہ تو انتہائی عام سا مکان دکھتا ہے۔ موہن نے دل ہی دل میں سوچا۔ جو گھر اس کو کتنے ہی سالوں سے خیالوں' خوابوں میں' آ آ کر رجھایا لبھایا کرتا تھا وہ تو بہت گرینڈ لکنگ تھا۔ بہت شاندار' موہن سوچوں میں گم تھا۔ اسے خبر بھی نہ ہوئی کہ افضل نے دروازہ کھٹکھٹا کر گھر کے مکینوں سے کوئی بات چیت بھی کر لی ہے۔ یہ گھر اب ایک کشمیری خاندان کی ملکیت تھا۔ ایک بوڑھے میاں بیوی اور جوان بیٹا اور بہو اس میں رہائش پذیر تھے۔ تقسیم کے بعد ان کے کسی رشتے دار کو

کلیم میں یہ حویلی حاصل ہوئی تھی۔ جسے وہ خواجہ نذیر کو دے کر خود لاہور جا بسا تھا۔

دروازہ بوڑھے خواجہ صاحب نے ہی کھولا تھا۔

یہ لوگ امریکہ سے آئے ہیں۔ ڈاکٹر موہن شرما تقسیم سے پہلے اسی گھر میں اپنے خاندان کے ساتھ رہتے تھے۔ یہ اپنا گھر دوبارہ اندر سے دیکھنا چاہتے ہیں' آپ کی اجازت ہو تو ہم لوگ اندر آ جائیں۔ افضل شیخ نے سیدھے سادھے لہجے میں اپنے آنے کا مدعا بیان کیا۔ مہمانوں نے محلے کے دوسرے مکانوں پر دلچسپی سے نظریں دوڑانا شروع کر دیں۔

بات سنتے ہی خواجہ صاحب نے پٹ سے گھر کا دروازہ کھول دیا۔ ان کے چہرے پہ کھیلتی مسکراہٹ نے خوش آمدید کہہ کر مہمانوں کو فوراً ہی مطمئن کر دیا۔

ان کے چہرے کی بشاشت اور انداز میں گرمجوشی اتنی نمایاں تھی کہ یوں محسوس ہوا گویا ان کے دل کے اندر کے کئی زنگ آلود دروازے آپ ہی آپ کھل گئے ہوں اور ان میں سے خوشبودار ہوا کے جھونکے باہر کو آنے لگے ہوں۔

موہن شرما اور اس کی بیوی رتنا خاموش' حیرت میں گم' اپنے گردوپیش کے سحر میں لپٹے' دو بتوں کی مانند ابھی نہ جانے کتنی دیر یونہی کھڑے رہتے کہ افضل شیخ کی آواز نے انہیں چونکا دیا۔

چلیں بھائی جی اندر چلیں!

وہ یوں خوشی خوشی انہیں لے کر اندر کو چل دیا جس طرح وہ اس کا بھی اپنا گھر رہ چکا ہو۔

موہن کے لیے وقت یکدم پچاس سال پیچھے چلا گیا۔ ٹائم مشین حرکت میں آ گئی۔

موہنے! جلدی سے آ کر پراٹھا کھا لے ٹھنڈا ہو رہا ہے۔

اچانک رسوئی گھر سے دادی اماں کی مخصوص پیار بھری آواز سنائی دی۔ ''مونی! مونی!'' ''وہیر آر یو؟''

ماما اسے نیچے صحن میں کھڑے ہو کر آوازیں دے رہی تھیں۔ انہیں معلوم تھا کہ موہن اپنے Nest میں گھسا بیٹھا ہوگا۔ وہ اکثر اسے ڈھونڈتے خود بھی اس کے گوشے میں جا پہنچتیں اور پیار سے چپت لگا کر کہتیں۔

Ther you are, my little thomas hardy!
Hiding in your nest. Far From the madding Crowd.

اور وہ ہنس کر پوچھتا۔

ماما یہ ٹامس ہارڈی کون تھا

بڑے ہوکر جب اس کی کتابیں پڑھوگے تو سب معلوم ہوجائے گا۔وہ اسے مطمئن کردیتیں۔

آیئے نا! بیٹھیے نا! خواجہ صاحب کے بیٹے نے بہو کو اشارہ کیا اور اس نے جلدی جلدی بیٹھک کے دروازے کھولنے شروع کر دیے۔ایک تھکی تھکی سی چرچراہٹ کے ساتھ دروازے کھل گئے اور ایک سیلی سی بو نے ان کا سواگت کیا۔شاید بیٹھک اب کم ہی کھلتی تھی۔

بہت منع کرنے کے باوجود خواجہ صاحب کی بہو نے کھانے پینے کی چیزوں کے ان کے سامنے انبار لگا دیے۔انہیں کچھ نہ کچھ لیتے ہی بن پڑی۔موہن اپنی بیوی کو باری باری سب کمرے دکھانے لگا' مگر جس کمرے میں بھی جاتا' بھولی بسری یادیں' بھٹکتی روحوں کی طرح اس سے آچمٹیں۔

''ہم نے امید ہے آپ کو ڈسٹرب نہیں کیا!'' رتنا بار بار تہذیب کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوچھتی۔

''کمال کرتی ہیں' جی آپ! یہ ڈاکٹر صاحب کا گھر تھا نہیں' ہے یعنی اب بھی ہے۔آپ اسے اپنا گھر سمجھیں' خواہ مخواہ غیروں والی باتیں کرکے ہمیں شرمندہ نہ کریں!

خواجہ صاحب کا بیٹا اپنائیت سے بولا۔رتنا متشکرانہ انداز میں اس کی طرف دیکھ کر مطمئن سی ہوگئی۔

کتنا خلوص' کتنا اپنا پن ہے ان لوگوں میں۔رتنا نے بھی اپنے شوہر سے دھیرے سے کہا۔

بھئی انسانی رشتے بہت مضبوط ہوتے ہیں۔جہاں کہیں بھی آپ ہوں دنیا کے جس کونے تک بھی آپ چلے جائیں' کچھ حقیقتیں یونیورسل ہوتی ہیں جنھیں کبھی جغرافیائی حدود میں قید نہیں کیا جاسکتا' انہی میں سے ایک حقیقت' انسان کا انسان سے رشتہ ہوتا ہے۔یہی ایک رشتہ ہے جس پر انسان ہمیشہ بھروسہ کرسکتا ہے!

موہن خوشی خوشی بولتا چلا گیا۔

رتنا! یاد ہے میں اپنے Nest کی بات کیا کرتا تھا... یہ رہا! اس نے سیڑھیوں کی نیچے چھپتے ہوئے ننھے منے کمرے کے دروازے کو ہولے سے دھکیلا۔

ارے ارے! ڈاکٹر صاحب اس کھڈ کو تو آپ رہنے ہی دیجیے۔اس میں تو نہ جانے کیا کیا کاٹھ کباڑ بھرا پڑا ہے زمانے سے بڑے خواجہ صاحب جھٹ سے بول پڑے۔

بس ایک پل کو جھانکنا چاہتا ہوں اور کچھ نہیں۔

خواجہ صاحب کچھ سمجھتے ہوئے پل کو پیچھے کو ہو گئے۔

موہن بغور اس ننھے سے گوشے کو دیکھتا چلا گیا۔ اس کا پینٹ بدستور اکھڑا اکھڑا سا لگ رہا تھا۔ شاید اس میں کبھی کسی نے رنگ و روغن نہیں کروایا تھا۔ جا بجا لکڑی کا ٹوٹا پھوٹا سامان اور پرانے اخبار کتابیں کھلونے وغیرہ بے ترتیبی سے بکھرے پڑے تھے۔

موہن نے جلدی سے دروازہ بھیڑ دیا۔

کیا ہم باغ دیکھ سکتے ہیں؟ کیا اب بھی اسی طرح پھلوں کے درخت موسم میں پھلوں سے لدے رہتے ہیں یا؟

موہن نے سوال کیا۔

باغ؟ کونسا باغ؟ اچھا! وہ پرانا باغ... وہ تو بیٹا تقسیم کے وقت مہاجرین کے کیمپوں کی نظر ہو گیا تھا۔ اس کے بعد جب لوگوں نے کلیم داخل کروائے تو اس کی زمین ٹکڑے ٹکڑے کر کے لوگوں میں بانٹ دی گئی۔ بڑی متنازعہ تھی وہ زمین کئی قتل ہوئے اس کی خاطر...

یعنی وہ باغ سرے سے ختم ہی ہو گیا؟ موہن بے یقینی کے عالم میں سر ہلانے لگا۔

نہیں نہیں ابھی اس اپنی حویلی کے بالکل ساتھ کا حصہ باقی ہے۔ چلیں آپ کو ہم اپنے باغ کی سیر کرواتے ہیں۔

چلیں جی!

خواجہ صاحب سب کو ساتھ لیے پچھواڑے کی جانب چل دیئے۔

یہ کیا؟ موہن کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ اس کے سامنے ایک وسیع و عریض سرسبز' کشادہ پھلوں کے درختوں سے لدے باغ کی جگہ ایک مختصر سالان شرمندگی کا سبزہ بچھائے ایک رات کی بیاہتا' بیوہ دلہن کی طرح اجڑا اجڑا اور سوگوار نظر آ رہا تھا۔ البتہ ان کی جگہ پذیرائی کے لیے ایک امرود اور ایک ٹھگنا سا آم کا بچا کھچا درخت ابھی موجود تھے۔

ڈاکٹر موہن کے دل میں ٹیس سی اٹھی۔ وہ سارے شرارتی محلے کے لڑکے اس کا اپنا بڑا بھائی' یار دوست نہ جانے کن دکھائی نہ دینے والے درختوں کے پیچھے جا چھپے تھے کہ نظر ہی نہ آتے تھے۔ وہ سب کی آنکھ بچا کر چپکے سے اس امرود اور آم کے درخت کو دھیرے دھیرے سہلاتا رہا۔ انہیں تسلی دینے کے سوا اور وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔

ڈاکٹر شرما کی وزٹ پوری ہو چکی تھی مگر اس کی تشنگی پہلے سے بھی کچھ زیادہ بڑھ گئی تھی۔ ماضی اور حال اس کے سامنے کھڑے تھے۔ وہ نہ جانے کون تھا؟ کہاں سے آیا تھا اور اس کی منزل کونسی تھی؟ کونسی مٹی اس کی اپنی تھی اور کونسی پرائی؟ وہ ایک عجیب سے

زمان ومکان کے نا سمجھ آنے والے سلسلے میں خود کو الجھا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ جو کچھ بھی تھا' یہ ضرور تھا کہ اس نے اس تجربے سے بہت کچھ حاصل کیا تھا اور رتنا بھی اپنے شوہر کی دیرینہ خواہش کے اس طرح' اتنی خوش اسلوبی سے پورے ہو جانے پر بہت مطمئن تھی۔

'' کہاں ہم امریکہ سے چلے۔ آغاز میرا ہندوستان میں ہوا' نوجوانی انگلینڈ میں بسر ہوئی اور اب پاکستان بھی میرا ہی گھر نکلا۔ میں جو گھوم پھر کر اس نقطہ آغاز پر پہنچا ہوں تو ایسا لگتا ہے جیسے میرا رشتہ اس عمارت اس شہر کے باسیوں سے ہمیشہ سے ہی جڑا رہا ہے۔ میں کہیں اور نہیں بلکہ اپنے ہی گھر واپس آیا ہوں۔

انہی سوچوں میں گم' ڈاکٹر موہن شرما اور اس کی بیوی پاکستان سے انگلینڈ کو روانہ ہو گئے۔

لندن میں ان کا دو ہفتے رکنے کا پروگرام تھا۔ موہن کی ماں کی فیملی کے اب بھی کافی لوگ لندن اور اس کی مضافات میں رہتے تھے مگر موہن کا صرف اپنی خالہ مارتھا سے ہی میل جول تھا۔ مارتھا کے بچے بھی امریکہ میں ہی مستقل قیام رکھتے تھے اس لیے خالہ زاد بہن بھائی سے موہن کا رابطہ رہتا تھا۔

آنٹی مارتھا اور اس کا شوہر فلپ موہن اور رتنا سے بہت خوش اخلاقی سے پیش آئے اور انہیں خوب گھمانے پھرانے کی دعوت دی مگر موہن اور رتنا لندن تو پہلے بھی کئی بار آ چکے تھے اور انہوں نے اپنے بچوں سمیت' میڈم تساڈ کا میوزیم' سٹریٹفورڈ آن ایوان' پکاڈلی سرکس اچھی طرح دیکھ رکھا تھا اس لیے اس بار انہوں نے خالہ اور خالو کی فراخدلانہ آفر کا شکریہ ادا کر کے انہیں اپنے ذاتی پروگرام کے بارے میں بتایا۔

کیا تم ویسٹ بری کے سویٹ رور Sweet River جاؤ گے؟

خالو قہقہہ مار کر ہنسا۔ مارتھا نے اپنے شوہر کو ان کی وزٹ کا مدعا بتایا۔

وہاں جا کر کیا کرو گے اپنا پرانا گھر دیکھ کر؟

کچھ نہیں' بس ایسے ہی! موہن اپنے بوڑھے خالو کو کچھ سمجھا نہ سکا۔

Roots کی تلاش میں بھئی۔ بہت کم عقل ہو تم!

مارتھا اپنے کانوں سے اونچا سننے والے شوہر کو چیخ کر بتایا۔

اوہ Roots اچھا اچھا' I See تم ماڈرن ڈے ایلکس ہیلی Alex Heley بننا چاہتے ہو!

خالو نے مزید تمسخر اڑایا۔

چپ رہو تمہیں کچھ سمجھ نہیں، خواہ مخواہ ہی بولے چلے جارہے ہو!

خالہ نے خالو کو ڈانٹ کر چپ کروا دیا۔

لندن میں حسب معمول بارش ہو رہی تھی اس لیے ان کے دو تین دن تو بارش کی نذر ہو گئے۔ پھر بھی شکر ہوا کہ ویک اینڈ پر دھوپ نکل آئی۔

کار کرائے پر لے کر موہن اور رتنا نے صبح صبح نکلنے کا پروگرام بنایا صبح کا سہانا وقت تھا۔ موسم بہت خوشگوار تھا، ہلکی ہلکی ٹھنڈ اور ہلکی ہلکی دھوپ ان کے جسموں کو گدگدی کر رہی تھی۔

ہائی وے پر تیز رفتار سے گاڑی چلاتے ہوئے موہن نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ انگلش کنٹری سائیڈ ہمیشہ کی طرح بہت خوبصورت، پرسکون اور صاف ستھرا تھا۔ ہائی وے کے دونوں اطراف سرسبز شاداب فارمز تھے، جن میں گھاس چرتی ہوئی کالی سفید چتری دار گائیں بہت اچھی لگ رہی تھیں۔

موہن نے رتنا کو اپنے Sweet River فارم ہاؤس کی تفصیلات سنانا شروع کر دی تھیں۔

وہاں میرا ہائیڈ آؤٹ اوپر کا Attic ہوا کرتا تھا۔ میں گھنٹوں وہاں کاٹھ کباڑ اور پرانی چیزوں کو الٹتا پلٹتا رہتا تھا۔ شیلی بھی وہیں رہتی تھی!

شیلی؟ کیا تمہاری کوئی انگلش گرل فرینڈ تھی۔

رتنا نے دلچسپی سے پوچھا۔

ہاں وہ ایک گرل تھی جو میری فرینڈ تھی۔ موہن مسکرا دیا۔

اچھا! کیا خوبصورت تھی؟ بہت گہری دوست تھی تمہارا۔

ہاں! ہم دونوں گھنٹوں باتیں کیا کرتے تھے۔ ایک دوسرے کو اپنے سارے دل کے راز بتایا کرتے تھے نہ جانے ''کہاں گئی'' .... نہ جانے اب اس کے بغیر کیسا لگے گا؟

نہ جانے زندہ بھی ہے کہ مر گئی۔ نہ جانے وہ زندہ تھی بھی یا نہیں۔ موہن نے اس کو شیلی اور اپنی دوستی کے بارے میں بتایا۔

رتنا اپنے شوہر کی رومانوی طبیعت سے اچھی طرح واقف تھی۔ وہ اس کی خیالی اور تصوراتی محبوبہ کے قصے سن سن کر مسکراتی رہی اور تھرماس میں سے گرم گرم کافی کی چسکیاں لیتی رہی۔

کافی پیئو گے؟ رتنا نے اسے بھی آفر کی۔

اونہوں! مجھے سردی نہیں لگ رہی۔

موہن نے ناٹلجیا کا نرم گداز کمبل اپنے اردگرد لپٹا ہوا محسوس کرتے ہوئے جواب دیا۔

پارک ایونیو پر موڑ کاٹتے ہی موہن کا دل تیزی سے ڈھڑکنے لگا۔ انگلستان میں ان کی فیملی کا پہلا گھر'فارم ہاؤس' اب بھی دور سے ہی صاف نظر آتا دکھائی دے رہا تھا۔

ویسے کا ویسا ہی ہے! موہن کے منہ سے یکدم نکلا۔

''بلکہ پہلے سے بھی بہتر حالت میں ہے۔ اردگرد نئی Picket Fence لگائی گئی ہے اور اور بیرونی ڈھانچے کا پینٹ بھی تازہ اور صاف ستھرا دکھائی دیتا ہے!

امپریسو! Impressive شاید کوئی مالدار لوگ اس کے مالک ہیں جو اتنی اچھی طرح اسے مین ٹین کر رکھا ہے! رتنا نے متاثر ہوکر تبصرہ کیا دونوں گاڑی پارک کر کے اتر آئے اور ماحول کا جائزہ لینے لگے۔ ہر چیز قدرتی حسن میں نتھری ہوئی تازہ وادا دکھا رہی تھی۔

بارن پہلے سے شاید بڑا کر دیا گیا تھا۔ گھوڑے' بکرے' سور' خرگوش' گائیں غرضیکہ پورا چڑیا گھر کھلا ہوا تھا۔ بارن میں ایک تبدیلی ضرور آئی تھی کہ وہ پہلے سے زیادہ ماڈرن کر دیا گیا تھا خشک گھاس رکھنے کی جگہ' اور چارہ کاٹنے کی مشینیں دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ مکینوں نے جانوروں کی پرورش اور دیکھ بھال پر خصوصی توجہ دی ہے۔

اب بھی دور دور تک کوئی دوسرا مکان نہیں تھا۔ خاموشی اور سکون سر جوڑے بیٹھے تھے۔

میرا تو دل گھبرا رہا ہے! کتنی ویرانی اور اداسی ہے یہاں! ہنگاموں کی شوقین رتنا نے بور ہوتے ہوئے کہا۔

چلو اندر چلتے ہیں اچلز سے ملتے ہیں۔ میں شیلی سے ملاقات کروں گا اور تم گھر کی اندر سے سیر کرنا! موہن نے نام کی تختی پڑھتے ہوئے رتنا کو چھیڑا۔ اور گھر کے مین دروازے کی بیل بجادی۔

دروازہ کسی نے تھوڑا سا کھولا۔ اندر لگی ہوئی حفاظتی زنجیر کی وجہ سے وہ اس سے زیادہ کھل ہی نہیں سکتا تھا۔

یس.....What do you want

شکوک وشبہات سے سر نکال کر پوچھا۔

آپ مسٹر مچل ہیں

موہن نے بوڑھے انگریز کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ رتنا بھی مسکرا دی۔ ہم ڈاکٹر اینڈ مسز شرما ہیں فرام یو ایس اے۔ کیا ہم اندر آ سکتے ہیں؟

کیوں؟ مسٹر مچل نے عینک کے شیشوں کو اچھی طرح ناک پر جماتے ہوئے پوچھا۔

دراصل یہ میرے شوہر کا بچپن کا گھر تھا۔ ان کی بہت سالوں سے خواہش تھی کہ وہ اسے دوبارہ اندر سے دیکھیں۔ یو... تو...If you dont' mind ... for Sentimental reasons

رتنا نے ان کے آنے کا مدعا بیان کیا۔

کیا ہے؟ کون آیا ہے؟

بوڑھے انگریز کے پیچھے ایک زنانہ بوڑھا انگریز سر نمودار ہوا۔

کچھ نہیں! یہ لوگ کہہ رہے ہیں یہ گھر ان کا بچپن کا گھر ہے اس لیے وہ اسے دوبارہ اندر سے دیکھنا چاہتے ہیں! بڑھیا شاید اونچا سنتی تھی اس لیے مسٹر مچل نے اس کے کان کے پاس منہ لے جا کر چیختے ہوئے کہا۔

لیکن اب تو یہ ہمارا گھر ہے! اب انہیں اس سے کیا لینا دینا!

بڑھیا ناگواری سے بولی۔

تم بھی خوامخواہ ہر ایک کے لیے دروازہ کھول دیتے ہو! نہ جانے کون ہیں کہاں سے آئے ہیں چور ہیں اچکے ہیں! ڈرٹی Pakis

بڑھیا بڑبڑاتی ہوئی اندر چلی گئی اور مسٹر مچل نے جلدی سے اپنے دروازے کے پٹ بند کر لینے کے بعد حفاظتی زنجیر چڑھا دی۔



شریف

ایکسکیوزمی! آپ کہیں کمیپڈ تو نہیں؟

سمکی نے اپنی لانبی، حسین گردن کو ہولے سے خم دے کر سوال کرنے والے کی طرف دیکھا۔

بہت شاندار مرد تھا۔ گرے سوٹ، سرخ سلک شرٹ، گلے میں نفیس پولکا ڈاٹ سکارف، اس پر خوب جچ رہا تھا۔

شاید نیا آیا تھا، کیونکہ اس سے پہلے سمکی نے اسے کسی پارٹی میں نہیں دیکھا تھا۔ لانبا قد، متوازن، صحتمند جسم، عمر کوئی پنتالیس کے قریب رہی ہوگی لیکن کم عمر دکھتا تھا۔

سمکی بھی کچھ کم پرکشش نہ تھی۔

یوں تو پارٹی میں ایک سے ایک خوبصورت عورت موجود تھی، لیکن سمکی کی چھب تو سب سے نرالی تھی۔ وہ مشرق اور مغرب کا ایک حسین امتزاج تھی۔

جدید طرز کے باب کٹ میں ترشے ہوئے بال، لوری آل کی امپورٹڈ ہیئر ڈائی میں بہت پرکشش دکھائی دے رہے تھے۔

اس کا لباس بھی مکمل طور پر ماڈرن سٹائل کا تھا۔ بہت سی کلیوں والا کرتہ یوں تو بہت کھلا تھا لیکن کمر کے پاس جا کر خود بخود تنگ ہو جاتا تھا۔ خوبصورت سیاہ، چست پاجامے میں اس کی ٹانگیں جہاں اپنا سڈول پن بھرپور انداز میں نمایاں کر رہی تھیں، وہیں اس کے سندھی کھسے اور سواتی چاندی کے زیورات اسے اپنی ایک علیحدہ انفرادیت عطا کر رہے تھے۔ وہ اپنے شوہر نعیم حسن کے ساتھ اپنی دوست شیریں کے گھر نیو ائیر کی پارتی اٹینڈ کرنے آئی ہوئی تھی۔ وہاں آئے سب لوگ ایک دوسرے کے جاننے والے، دوست، یار، ملنے جلنے والے تھے۔

آپس میں بے تکلفیاں، دوستیاں، یارانے تھے۔ اچھا وقت گزارنا ان کا مشغلہ اور مقصد حیات تھا۔ ہیونگ اے گڈ ٹائم ان کی زندگی کا ماٹو تھا۔

نیا سال صرف ایک گھنٹہ دور تھا۔ مہمان موسیقی سے محظوظ ہونے کے ساتھ ساتھ، ملنے ملانے، پینے پلانے میں مصروف و مشغول

تھے۔

سمکی نے ایک کونے میں کھڑے اپنے شوہر نعیم پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی۔ وہ کسی دوست خاتون سے ڈانس کی درخواست کر رہا تھا۔

''ہیلو'' نو وارد نے کھنکار کر سمکی کی توجہ چاہی۔

کمٹ مینٹس توڑی بھی جاسکتی ہے۔ سمکی نے مسکرا کر جواب دیا۔

ارے ارے! میں بھلا آپ کو کمٹ مینٹس توڑنے کی پریشانی میں ڈالنے کی جسارت کیوں کرنے لگا! کبھی کبھار کمٹ مینٹس بدل لینے سے بھی تو کام چلایا جاسکتا ہے نا۔

اس نے مشروب کو لبوں سے لگا کر اور سمکی کے سراپا کو آنکھوں سے پی کر شوخی سے جواب دیا۔ اور سمکی کی طرف تعریفی نظروں سے دیکھنے لگا۔ سمکی ہنس پڑی۔ اس کا نقرئی قہقہہ ماحول کو ایک مضراب کی طرح چھو کر جلترنگ بنا گیا۔

مجھے وحید قریشی کہتے ہیں۔ مرد نے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

میں سمکی ہوں۔

صرف سمکی؟

صرف سمکی! اس نے اپنی کڑھائی والی چادر بڑے سٹائل سے کھسکائی۔ اس کا چاندی کا زیور جھنجھنا اٹھا اور وحید قریشی اس کی خوبصورت کالر بون کی تعریفی نظروں سے دیکھنے سے خود کو باز نہ رکھ سکا۔ جس کی وجہ سے اس کی گردن بہت پروقار لگ رہی تھی۔

لگتا ہے آپ دونوں مل چکے ہیں۔ ویری گڈ' آپ نے اچھا کیا۔ جو یہ کام خود ہی کر لیا۔ اب مجھے آپ دونوں کو متعارف کروانے کے تکلفات پورے نہیں کرنے پڑیں گے۔ ویسے یہ ضرور بتا دوں وحید جی! کہ سمکی میری بڑی خاص دوست ہے اور آپ تو خاص چیزوں اور خاص بندوں میں ہی دلچسپی رکھتے ہیں نا۔

زریں نے خوشدلی سے کہا۔

بھئی سمکی' یہ وحید صاحب احسن کے پرانے دوست ہیں۔ بہت عرصے سے ان سے رابطہ نہ تھا۔ اب انہوں نے ہمیں خود ہی ڈھونڈ نکالا ہے۔ معمولی آدمی نہیں' بہت بڑے آرکی آلوجسٹ ہیں ہمارے۔

اور واقعی! آرکیالوجی سے تو مجھے بھی بہت دلچسپی ہے! باؤ نائس! سمکی کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

چند ہی لمحوں میں وہ بے تکلف ہو گئے۔ وحید اسے لاہور کے تاریخی مقامات' عجائب گھر' نوادرات کے بارے میں معلومات دینے لگا۔ سمکی اس کی قابلیت اور ذہانت سے تو متاثر ہو ہی رہی تھی مگر خود کو وحید کی اس کی ذات میں دلچسپی لینے سے خوش ہونے سے بھی بہت مسرور مطمئن پا رہی تھی۔

گریٹ پارٹی یار! کرنل حفیظ کسی بات پر اونچے اونچے قہقہے لگاتا جا رہا تھا۔ ابھی تو پینے کا ایک گھنٹہ اور باقی تھا۔ اسے تو ہلکا سا نشہ بھی ہو جاتا تو معمولی معمولی باتوں پہ اتنی زور زور سے ہنستا کہ اس پر شکسپئر کے فول ہونے کا گمان ہونے لگتا۔

اور آپ کیا کرتی ہیں؟ میرا مطلب ہے' خوبصورت لگنے کے علاوہ؟

وحید قریشی کی سمکی کی ذات میں دلچسپی بڑھنے لگی۔

سمکی ہنس دی۔ وہی نقرئی قہقہہ' وہی جلترنگ کا سا سماں۔

میں بہت مصروف رہتی ہوں۔ کئی سوشل ویلفیئر اداروں سے میرا تعلق ہے اور پھر میں اپنی بوتیک ''می اینڈ یو'' کے نام سے بھی چلا رہی ہوں۔ گھر' شوہر' بچے' یو نو' زندگی بہت مصروف گزرتی ہے۔

یہ تو ہے۔ اسی لیے آج کل زندگی میں تو جو لمحہ خوشی کا میسر آ جائے اسی کو غنیمت جانئے۔ میں بھی دن بھر آرکی آلوجی اور ریسرچ ورک میں کبھی کبھار تو خود کو بھی کوئی آثار قدیمہ لگنے لگتا ہوں۔ لیکن شام کو جم خانہ میں سومنگ یا ٹینس کھیلی اور میرا سسٹم ریلیکس ہو گیا۔

اور رات کو!

رات ہمیں تنہائیوں کا احساس دلانے کو ہر چوبیس گھنٹے بعد ہی چلی آتی ہے۔ کیا کریں؟ چاند اور میں ہمیشہ سے اکیلے ہیں!

آپ کی مسز؟ سمکی نے کچھ جھجکتے ہوئے پوچھا۔

وہ اور میں علیحدہ علیحدہ دنیاؤں میں رہتے ہیں۔ ان کو رات کو پونے نو بجے ہی نیند آ جاتی ہے' وہ ڈاکٹر ہیں ہسپتال میں کام کر کر کے تھک جاتی ہیں۔ ویسے بھی.... وہ خلاؤں میں گھورنے لگا۔

آئی انڈرسٹینڈ! دراصل ذہنی ہم آہنگی ہونا بہت ضروری ہے!

بالکل ٹھیک کہا آپ نے! وہ جلدی سے بولا۔

اور وہ تو قسمت سے ہی ملتی ہے! لیکن زندگی ضائع کرنے کی چیز تو نہیں نا' میں تو خود ایسا ہی سوچتی ہوں ورنہ میں تو ڈپریشن کی اس سٹیج پر پہنچ جاؤں کہ ویلیم کی ملی گرام ہر رات ہی بڑھانی پڑ جائیں۔

یکا یک میوزک تیز ہو گیا۔

I Wanna Live Forever

نغمہ بھی ہیجان خیز تھا۔ ڈیک کا والیوم ناچتے ہوئے جوڑوں کو دیوانہ بنائے دے رہا تھا۔

لائٹنگ والوں نے سٹروب لائٹس کا بڑی خوبصورتی سے استعمال شروع کر دیا تھا۔ سٹروب لائٹس کا نیلا نیلا رنگ جب ٹکڑوں میں ناچتے ہوئے جوڑوں پر پڑتا تو یوں محسوس ہوتا گویا جسموں کے نیلے نیلے ٹکڑے فضا میں پتھرا کر رہ گئے ہوں' چند لمحوں کے لیے منجمد ہو کر سانس لینا بھول چکے ہوں۔ نیلا رنگ نیزہ بن کر ان کے متحرک جسموں کو بار بار چھلنی کیے دے رہا تھا اور نیلے رنگ کے خون میں تڑپتے جسم اذیت کی لذت میں ڈوبے اور اور چیخ رہے تھے۔

یہ ہجوم زندہ اور زندہ دل لوگوں کا تھا۔ غم' فکر' اگر ان کی زندگی میں تھے بھی تو دور کیسی طارق میں' کسی مناسب وقت کے لیے انہوں نے سنبھال رکھے تھے۔ خوشیاں البتہ انہیں عزیز تھیں' اتنی کہ وہ ان کے حصول کے لیے چاہے وہ چند لمحوں کی ہی کیوں نہ ہوں' کچھ بھی کرنے کو تیار تھے۔

زریں کی دوست پونی بھی نیو ائیر پارٹی میں اپنے نئے ساتھی کے ساتھ موجود تھی۔ پونی امریکہ میں پندرہ سال گزارنے کے بعد پاکستان دوبارہ آ کر سیٹل ہوئی تھی۔ اس کا میاں پاکستان کو رہنے کے قابل نہیں سمجھتا تھا اور مصر تھا کہ پونی واپس چلی چلے لیکن پونی امریکہ کی مشینی زندگی اور مادی لذتوں سے بور ہو چکی تھی۔ ویسے بھی اس کا خیال تھا کہ بچوں کو امریکہ کے آزادانہ معاشرے سے بچانے کی پوری پوری کوشش کرنی چاہیے۔ اس لیے وہ امریکہ کو چھوڑ آئی تھی۔ اس کا میاں سال میں ایک دو چکر لگا لیتا اور گرمیوں کی چھٹیوں میں وہ امریکہ ہو آتی۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ شادی کو گھسیٹا جا رہا تھا حالانکہ اس کے بے جان جسم میں اب جا بجا تکلیف دے پھوڑے اور پھنسیاں نکلنا شروع ہو چکی تھیں۔

فاصلے صرف جغرافیائی نہیں رہے تھے۔

مزاجوں کے تضاد کا بہت بڑا سا بحر اوقیانوس' طرز زندگی کے فرق کا ٹھنڈا ٹھار آئس لینڈ' دلچسپیوں اور ضروریات کی تبدیلیوں کا' رنگ برنگے ٹکڑوں پہ مشتمل یورپ' راستے میں حائل ہو چکا تھا۔ مگر پونی مشکلات کا مقابلہ کرنا جانتی تھی۔ اس لیے ڈٹی ہوئی تھی۔ ہائے بلی! ادھر آؤ میں تمہیں وحید قریشی دی گریٹ آرکی آلوجسٹ سے ملاؤں۔

سمی نے بلی کا بازو کھینچا۔ بلی بھی اس کی بے تکلف دوست تھی۔ میوزک کافی تیز تھا' اس لیے بلی نے اشارہ کیا اور تینوں کمرے

سے ملحقہ ٹیرس پہ چلے آئے۔ بلی بھی بڑی دیر سے اس ہینڈسم سے آدمی کے بارے میں دل ہی دل میں متجسس ہو رہی تھی۔ اب سمکی نے اس کا تعارف کروایا تو وہ بہت خوش ہوئی۔

خلیل آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔ آج کل وہ سیاچین پر ایکسرے سائز کے لیے گئے ہوئے ہیں۔ بے چارے سردی میں تنہا وہاں ہیں۔ اور میں یہاں۔ آج تو نیو ائیر کے شروع ہونے پر میں انہیں بہت مس کر رہی ہوں! کاش وہ یہاں ہوتے!

وہ سچ مچ اداس ہوگئی۔

بلی کا خاوند خلیل چھٹہ فوج میں کرنل تھا۔ بلی اور خلیل کا جوڑا' ان بہت خوش نصیب اور نادر جوڑوں میں سے ایک تھا جن کی شادی شدہ زندگی ابھی تک خوشگوار کہلائی جا سکتی تھی' کیونکہ شادی کے کچھ ہی سال بعد اکثر میاں بیوی ایک دوسرے سے بے گانہ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ سمجھوتوں کی رسی سے بنے' ہچکولے کھاتے' خطرناک پل پر احتیاط سے قدم جمائے' ایک پل سے دوسرے پل کا سفر کرتے دعائیں مانگتے رہتے ہیں کہ خیریت ہو' خیریت رہے۔

انہیں بھلا سیاچین جانے کی کیا ضرورت تھی؟ کالا گلاب تو ان کے پاس تھا۔

ڈاکٹر وحید نے بلی کی سانولی سلونی رنگ کی تعریف کر کے اس کا تو من ہی لوٹ لیا۔

ہائے اللہ! واٹ اے جنٹلمین یو آر! ہاؤ سویٹ! آئی لائک یو! سنا سمکی تم نے۔

بلی کے چہرے پر بتیاں روشن ہوگئیں' اداسی کا غبار یک چھٹ گیا۔

چلیں اچھا ہے! آپ کچھ چیئر اپ تو ہوئیں ورنہ کرنل صاحب کی فرقت کا غم دور کرنے کے لیے ہم تو سمجھنے لگے تھے کہ ہمیں سیاچین جا کر انہیں خود ہی آپ کے لیے لانا ہوگا۔

وحید شوخ ہوتا جا رہا تھا۔

بلی سانولی سلونی مگر تیکھے نقوش والی لڑکی تھی۔ اوپر سے سخت اور کھردری مگر اندر سے تازہ بھنی ہوئی مونگ پھلی کی طرح نرم اور خستہ تھی۔ کرنل صاحب جونہی ایکسرسائز پر شہر سے باہر جاتے' وہ اداس ہو کر اپنی سہیلیوں کو ملنے چلی آتی۔ اس کی سہیلیوں کا حلقہ اسے روز روز پارٹیوں' گیٹ ٹو گیدرز میں مصروف رکھتا اور وہ اپنا دل بہلانے میں کامیاب ہو جاتی۔ وہ اپنی سہیلیوں میں گروپ لیڈر کی سی حیثیت رکھتی تھی۔

بلی زیادہ تر ٹیلی فون فرینڈشپ میں یقین رکھتی تھی۔ اس نے اپنی سہیلیوں کے لیے کچھ ان لکھے قانون بھی بنا رکھے تھے جن پر

وہ ان سب کو سختی سے عمل کرواتی تھی۔ اس کا سب سے ضروری قانون یہ تھا کہ کوئی سہیلی کسی بھی مرد دوست سے سنجیدگی سے انوالو نہیں ہو سکتی۔ اگر کوئی 'جذباتی وابستگی' کا شکار ہونے لگتی یا دوسری طرف سے اسے ایسا خدشہ محسوس ہونے لگتا کہ دوست حضرت زیادہ ہی ملکیت کا حق جتانے لگے ہیں تو بجلی فوراً ہی ایک کانفرنس بلاتی۔ مجرم کو سمجھایا بجھایا جاتا۔ رولز آف دی گیم بتائے جاتے حتیٰ کہ گروپ میں سے نکال دیے جانے کا بھی ڈراوا دیا جاتا۔

وہ کہتی تھی' ہم سب لوگ خوشیوں کی تلاش میں رہتے ہیں اس لیے سرسری سی' بے ضرر' میل فی میل دوستیاں تو کر سکتے ہیں' سنجیدہ افیئرز چلانے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے۔ اگر ہم لوگ ایسا نہ کریں تو بہت نقصان ہوتا ہے۔ گھر بار' بچے' ساری زندگی۔ اپ سیٹ ہو جاتی ہے اور ایسا ہونے دینا تو کوئی عقلمندی نہیں۔ مناسب یہی ہے کہ صرف لمحے کی مسرت کے تعاقب اور حصول میں ہی جیو۔ اس کے بعد اپنے اپنے محفوظ ٹھکانوں' عزت دار گھرانوں کو لوٹ جاؤ۔

یوں تو سب سہیلیاں اس کی اس بات سے متفق ہو جایا کرتی تھیں لیکن ڈولی ہر بار ایک مسئلہ کھڑا کر دیتی تھی۔ تین بچوں کی ماں ہونے کے باوجود اس میں جذباتی ناپختگی ابھی تک موجود تھی۔ کسی مرد دوست نے دو تین ٹیلی فون اور اس کے حسن و جمال' کپڑوں کے سٹائل کی تعریف کی نہیں کہ ڈولی صاحبہ چاند کو دیکھ دیکھ کر آہیں بھرنا ہو گئیں۔ بجلی اور فرینڈز نے اس کا نام 'ٹین ایجر' رکھ چھوڑا تھا۔

جیسے ہی ڈولی کو کسی نئی محبت کا عارضہ لاحق ہوتا۔ جھٹ سے کانفرنس کے ارکان اپنی اپنی کرسیاں سنبھال لیتے۔ بجلی اپنے عہدے کا پورا' پورا فائدہ اٹھاتی۔

ڈولی ڈارلنگ! ہم یہ نہیں چاہتے کہ تم زندگی کو انجوائے نہ کرو۔ بھئی ہم ظالم نہیں ہیں لیکن تمہارے دشمن بھی نہیں ہیں۔ تمہیں سمجھانا ہمارا فرض بنتا ہے۔ دیکھو فون پہ گپ شپ کرو۔ لانگ ڈرائیوز پر جاؤ' تحفے قبول کرو۔ پرفیومز اور بوتیک شاپس کے کپڑے لے کر دیتا ہے تو لو۔ ہم کب منع کرتے ہیں۔ ٹھیک ہے بندہ وانٹڈ محسوس کرے تو اس کی انا کی تسکین ہوتی رہتی ہے مگر اس سے آگے جانا غلط ہے۔ پھر ممنوعہ علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ اگر پارٹی میں سے ایک ساتھی بھی اکیلا' اپنے خود متعین کردہ راستے پر چل نکلا تو وہ یقینی طور پر گھنے جنگل میں بھٹک کر رہ جائے گا۔ اور کان کھول کر سن لو۔ پھر کوئی سرچ پارٹی اس کی تلاش میں اس کے پیچھے نہیں جائے گی۔ ہاں اور ویسے بھی ہم انسان ہیں کوئی سارس تو نہیں ہیں۔ کیونکہ انسان تو اشرف المخلوقات ہے اسے زندہ رہنے کے لیے ہر حال میں سروائیو ایک بار اپنا جوڑ کسی دوسرے سارس سے بناتا ہے۔ اگر اس کا ساتھی مر جائے تو زندگی بھر اکیلا رہتا ہے مگر دوسرا ساتھی

نہیں بنا تا مگر۔ہم سارس نہیں ہیں۔ہمیں انسانوں کی' ساتھ کی ضرورت رہتی ہے۔

ڈولی یہ سب باتیں عقل سے تسلیم کرتی تھی مگر اپنی طبعی نرم دلی کے ہاتھوں ہر بار مجبور ہو جایا کرتی تھی۔

بارہ بجنے میں چند لمحے باقی رہ گئے تھے۔کاؤنٹ ڈاؤن شروع ہو گیا۔ایک دو تین... بارہ بجتے ہی ہر طرف شور بپا ہو گیا۔ہیپی نیو ائیر! ہیپی نیو ائیر! جام ٹکرانے لگے۔رنگ برنگے غبارے کمرے میں ادھر ادھر تیرنے لگے۔خاوند بیویاں ایک دوسرے سے بغلگیر ہو گئے۔کچھ خاوند اور کچھ بیویاں ذہنی طور پر کسی اور سے بغلگیر ہو رہے تھے۔کچھ خاوند اور کچھ یونہی نظروں سے سلام' پیام' نئے سال کی مبارکباد اور تنہائی میں گلے ملنے کے وعدے لے کر کام چلا رہے تھے۔سب لوگ بہت خوش تھے۔

کھانے کا انتظام ہو چکا تھا اس لیے رقص وموسیقی فی الحال روک دی گئی تھی۔

کھانا لگ گیا ہے! پلیز' اپنی مدد آپ کیجئے۔کوئی تکلف نہ کیجئے۔

زریں کے شوہر نے اعلان کیا۔اس نیو ائیر پارٹی میں کھانے کو بہت کچھ تھا۔تکے' کباب' روسٹ' چرغے' سلاد' پھل اور منہ کا مزا بدلنے کے لیے طرح طرح کی مٹھائیاں بھی۔

زریں اور اس کا شوہر مہمانوں کو کھانے کا بار بار پوچھنے کے ساتھ ساتھ ان کا ایک دوسرے سے تعارف بھی کرواتے جا رہے تھے۔

شہر کے سب سے مہنگے اور اونچی کلاس کے ہوٹل کے مالک سعید گردیزی اور اس کی بیوی شالیز' ملتان روڈ پر واقع ٹی شرٹ ایکسپورٹ فیکٹری کا مالک ناصر خان اور اس کی بیوی حمیرا بھی وہاں موجود تھے۔

حمیرا اپنے ساتھ اپنا نیا نیا لندن ریٹرن بھائی ٹونی بھی لے آئی تھی۔ٹونی بہت کھلنڈرا اور من چلا تھا۔بیس سال یورپ میں گزار لینے کے بعد اب اس کا دل گوری چمڑی سے اکتا گیا تھا۔حمیرا اور اس کی سہیلیاں اکثر اسے اس کی یورپین بیوی کے پھیکے پھاکے حسن کی وجہ سے چھیڑا کرتی تھیں اور وہ علی الاعلان اپنی اس 'بیوقوفی' کا اعتراف کر لیا کرتا تھا۔اب اسے اپنے دیس کے سانولے سلونے مشرقی حسن کی قدر آئی تھی اور اب تو ہر نمکین گندمی رنگ اور کالی زلفوں والی لڑکی اسے دیوانہ بنا دیتی تھی اور لڑکی دیکھتے ہی کتے کی طرح دم ہلاتا' رال ٹپکاتا' اس کے گرد بھنورے کی طرح منڈلانے لگتا۔

ڈولی' بیلی' سمکی' حمیرا' زریں سب کا ہنستے ہنستے برا حال ہو جاتا اور اس کا خوب بھری محفل میں مذاق اڑایا جاتا۔بہت لطف رہتا۔

پارٹی چل رہی تھی۔ رات لمحہ لمحہ رنگ بدل رہی تھی۔ کچھ ساتھی بدلے کچھ پرانے قائم رہے۔ نئے ٹیلیفون نمبرز کا تبادلہ ہوا' کچھ نہ صرف معنی خیز نظروں کے تبادلے پر ہی اکتفا کی۔ کچھ محتاط رہے اور کچھ کی احتیاطوں کے'خون میں مشروب کی آمیزش نے فلتے اڑا کر رکھ دیئے۔

صبح چار بجے کے قریب پارٹی ختم ہوئی۔ سب لوگ ایک دوسرے کو نئے سال کی بار بار مبارکباد دیتے رخصت ہونے لگے۔

"بھابی! واپسی پر آپ ڈرائیو کر رہی ہیں نا!" ٹونی نے ایک مہمان کو ڈولتے' ڈگمگاتے قدموں سے چلتے دیکھ کر کہا۔

جب پتہ ہے زیادہ ڈرنک ہینڈل نہیں کر سکتے تو پھر اپنی حد کیوں پار کر جاتے ہیں؟

بھابی مصنوعی غصے سے بولیں۔

ڈونٹ مائنڈ اٹ بھابی! آخر نیو ایئر ہے۔ سیلی بریٹ تو کرنا تھا نا! ویسے آپ بھی ذرا احتیاط سے ہی گاڑی چلایئے گا' آپ بھی مجھے!

اس نے مسکرا کر بات بیچ میں چھوڑ دی۔

جی نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اپنے حواس میں ہوں۔ میں نے تو بس لائٹ سا ہی لیا تھا۔ ڈونٹ وری! ویسے مشورے کا شکریہ' آپ اپنی بیگم کی خبر لیں۔ ہماری فکر چھوڑیں۔

وہ بھی مسکرا دی۔

سمکی اور اس کا شوہر جب ملگجے اندھیرے میں گھر پہنچے تو ان کے بچے سو رہے تھے۔ وہ دونوں دبے قدموں ان کے کمرے میں گئے' ان کی معصوم جبینوں پہ پیار کیا' انہیں ہیپی نیو ایئر وش کیا اور اپنے بیڈ روم میں سونے کے لیے چلے گئے۔

سمکی سکون سے دوپہر کے ۲ بجے تک سوتی رہی۔ اس کی ملازمہ شیداں نے اس کے بچوں کو ناشتہ' کھانا وغیرہ دے دیا تھا۔ گھر کی صفائی بھی کروالی تھی۔ بچوں کو اور اسے بھی پتہ تھا کہ جب بیگم صاحبہ پارٹی سے رات دیر کو لوٹیں تو انہیں ڈسٹرب نہیں کرنا۔ ان کے پاس اسی وقت جانا ہے جب وہ خود اٹھ جائیں۔ بچے سمجھدار تھے' اپنے آپ کو خود محفوظ رکھنے کے طریقے انہیں بخوبی آتے تھے۔ وی سی آر لگا لیا یا کامک بکس پڑھ لیں زیادہ بور ہوتے تو فرینڈز کو فون کر لیا یا ڈرائیور کے ساتھ کسی فرینڈ کے گھر ہو آئے۔ ان کا وقت اسی طرح گزر جایا کرتا تھا۔

سہ پہر کے تین چار بجے تک سمکی اور نعیم نہا دھو ناشتہ کر کے تازہ دم ہو چکے تھے۔ انہوں نے کچھ دیر بچوں کے ساتھ گپ شپ

کی ٹی وی دیکھا اور آرام کیا۔

شام ہوئی تو نعیم نے جم خانہ جا کر سوئمنگ اور ٹینس کھیلنے جانے کی تیاری شروع کر دی۔ آج اس کا کور کمانڈر آفندی سے ڈبلز کھیلنے کا پروگرام بنا ہوا تھا' اس لیے وہ تو اپنا بیگ اٹھا کر جلدی جلدی نکل گیا اور سمکی بچوں کو ہوم ورک کرتا چھوڑ کر لاؤنج میں چلی آئی۔

فون کی گھنٹی بجی۔

ہیلو! ہائے مائی ڈیئر۔ ہیپی نیو ائیر!

ہیلو جی! آپ کو بھی نئے سال کی بھرپور مبارکباد! سمکی نے جواباً کہا۔

سوری میری چھمو رانی! میں رات پارٹی میں نہیں آ سکا۔ مجھے پتہ ہے تم مجھ سے بہت ناراض ہو گی لیکن کیا کرتا؟ کیسے آتا؟ عین وقت پر بیگم صاحبہ کی ڈسک سلپ ہو گئی۔ لو بھلا بتاؤ' یہ بھی کوئی وقت تھا ڈسک سلپ کرنے کا؟ قسم سے بہت بور کیا اس نے ساری رات پڑی ہائے ہائے کرتی رہی۔ نیو ائیر کی حسین رات غارت ہو کر رہ گئی۔ اچھا خیر تم سناؤ۔ میری رانی نے مجھے بہت مس کیا ہو گا۔ ہے نا؟ اور میرا پریزنٹ کیا ہوا سوٹ پہن کر تو تم یقیناً مغلیہ شہزادی لگ رہی ہو گی۔ کاش میں تمہیں ان کپڑوں میں دیکھ سکتا۔

وہ بغیر رکے بولتا چلا گیا۔

ہاں! تم تو آئے نہیں۔ میرا دل پارٹی میں کیسے لگ سکتا تھا! سمکی نے فون والے کو خفگی سے جواب دیا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ہینڈسم ڈاکٹر وحید کا تصور کرنے لگی۔ کتنی توجہ دے رہا تھا وہ اس پر۔ اس کا ڈریسنگ سٹائل' اس کا دھیما دھیما رومانوی انداز گفتگو کتنا متاثر کن تھا سب کچھ۔

میرے بغیر جو بوریت تمہیں ہوئی اس کے لیے غلام معافی کا خواستگار ہے۔ معاف کر دو جانِ من!

جاؤ کر دیا۔ سمکی کو اس وقت اس کی لمبی چوڑی وضاحتوں سے کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے دل میں ایک نیا شگوفہ پھوٹ چکا تھا اور وہ اس نئی تبدیلی سے بہت خوش تھی۔

آئی انڈرسٹینڈ! آخر تم صوفیہ کو تکلیف میں چھوڑ کر کیسے آ سکتے تھے! کوئی بات نہیں میں نے مائنڈ نہیں کیا!

کیا کہا؟ تم نے مائنڈ نہیں کیا؟ سویٹ ہارٹ یہ تم ہی بول رہی ہو؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟

اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس کا تو خیال تھا سمکی چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لے گی۔ اس سے جھگڑا کرے گی' رو رو کر اپنی آنکھیں سجا لے گی مگر سمکی اس وقت بڑی انڈرسٹینڈنگ بنی ہوئی تھی۔ اسے سمکی سے اور زیادہ پیار ہونے لگا تھا کتنی اچھی تھی وہ۔ اسی

لیے تو وہ ایک دوسرے کے اتنے قریب تھے۔ وہ اس کا اتنا خیال جو رکھتی تھی۔ اس کے مسائل کو سمجھتی تھی۔

اچھا دیکھو اس وقت میں لمبی بات نہیں کر سکتی میں نے ڈرائیو روے میں نعیم کی گاڑی آتے دیکھ لی ہے! او کے؟ بائے!

سمکی نے ہاتھ میں پکڑی چٹ پہ لکھے نمبر کو غور سے دیکھا جو اس نے ابھی ابھی اپنے رات والے پرس میں سے نکالا تھا۔ نعیم تو ابھی بمشکل جم خانہ پہنچا ہوگا' مگر سمکی کا دل' نئے نمبر پر بات کرنے کو چاہ رہا تھا اسی لیے اس نے بہانہ بنا دیا۔

او کے بائے جھمو رانی! جلدی فون کرنا' جیسے ہی موقعہ ملے۔

فون بند ہو گیا۔

سمکی نے نمبر ڈائل کیا۔ فون وحید نے ہی اٹھایا۔

آج کیسی ہیں آپ؟ مائی فیئر لیڈی؟ بھئی آپ نے تو بہت ظلم ڈھایا!

کیوں کیا ہوا؟

دل لوٹ لیا اور کیا ہونا تھا۔ جناب رات سے ہی اس بندہ ناچیز کے ہوش حواس ٹھکانے نہیں ہیں۔ اب کیا ہوگا ہمارا! ظالم کچھ رحم کھا! سمکی ہنس ہنس کر دوہری ہو گئی۔ وہی ہنسی جیسے جلترنگ سے نغمے پھوٹ نکلے ہوں۔

کمال کرتے ہیں آپ! اب اتنا بھی نہ بنایئے!"

"سچ کہتا ہوں۔ نگر نگر' قریہ قریہ گھوما ہوں' امریکہ' افریقہ' یورپ۔ ساری دنیا دیکھی ہے لیکن آپ کی شخصیت کا سا جادو کسی میں نہیں دیکھا۔ پاکستان جیسا حسن کہیں نہیں ملا۔

اوہ واقعی؟ وہی کھلکھلاہٹ' غنچوں کے چٹکنے کی نرم آواز۔

اور میں پاکستان کا ہر شہر گھوما ہوں مگر لاہور جیسا حسن مجھے کہیں نہیں ملا۔ اب آپ کہیں گے آپ لاہور کا ہر گھر گھومے ہیں لیکن آپ کو مجھ جیسا حسن کہیں نہیں ملا؟

یو آر اے ڈیول! وہ اس کی حاضر جوابی کا قائل ہو گیا۔

اگر میں پرنس چارمنگ ہوتا تو سچ مچ شیشے کا سینڈل لیے رات سے مڈنائٹ سنڈریلا کی تلاش میں لاہور کا ہر گھر جھانک چکا ہوتا!

سمکی خاموش ہو گئی۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

پھر کب دکھائی دے گا ہمیں ہمارا آدھی رات کا چاند؟

انتظار کیجئے۔ انتظار کی لذت سے ہم آپ کو آشنا کرویں گے۔

صرف انتظار کی لذت سے وصال کی لذت سے نہیں؟

ہائے اللہ بڑے بے صبرے ہیں آپ! ابھی رات ہی تو پہلی ملاقات ہوئی ہے۔

ہمیں نئی ملاقاتیں پسند ہیں۔ پرانی چیزوں میں ماضی کے آثار قدیمہ ہی ہمیں پسند ہیں اور کچھ نہیں۔

مجھے بھی ویسے آپ کے سبجیکٹ سے بہت دلچسپی ہے۔ میں نے آرکیالوجی پر کئی کتابیں پڑھ رکھی ہیں۔ موہنجوداڑو مجھے ہمیشہ فیسی نیٹ کرتا رہا ہے۔

آپ نے لاہور ٹھیک سے دیکھ رکھا ہے؟ وحید سنجیدگی سے بولا۔

دیکھ رکھا کیا مطلب؟ ظاہر ہے یہاں رہتی ہوں دیکھا ہوا ہی ہے؟

جی نہیں۔ دیکھا اور رہنا' دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ آپ یہاں رہتے ضرور ہیں لیکن لاہور کی تاریخ کو جاننا' سمجھنا' اس ورثہ کی خوشبو کو محسوس کرنا کچھ اور ہی بات ہے۔ شہر لاہور ہماری تاریخ میں ایک جگمگاتے ہوئے نگینے کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ ہماری تاریخی عمارات تو خیر مغلیہ دور کی شان و شوکت بیان کرتی ہی ہیں لیکن اس شہر کی فصیل' پرانے دروازے' مٹی کا ریزہ ریزہ' اپنے اندر ماضی کی ایک داستان چھپائے ہوئے ہے۔

آج کل آپ اس فلیڈ میں کیا کر رہے ہیں؟ سمکی نے مزید دلچسپی لیتے ہوئے سوال کیا۔

میں اندرون شہر کے پرانے گھروں سے نوادرات اکٹھے کر رہا ہوں۔ ویسے آپ نے پوچھا تو بتا دوں کہ ان دنوں میری ریسرچ کا رخ شاہی قلعے کے اس طرف والے بازار کے پرانے گھروں کی طرف ہے۔

آپ کا مطلب ہے؟ وہ بے یقینی کے عالم میں بولی۔

ہاں ہاں بھئی بازار حسن! وہ بھی تو ہمارے شہر میں تاریخی حیثیت کی حامل جگہ ہے۔

ہائے اللہ! مجھے تو یقین نہیں آ رہا۔

کیوں اس میں اتنا حیران ہونے والی کونسی بات ہے؟

فون پر ابھی یہ دلچسپ گفتگو جاری ہی تھی کہ باہر گاڑی کا ہارن بجا۔ سمکی نے پردہ ہٹا کر دیکھا' اس کی سہیلی ڈولی اور اس کے دونوں بچے گاڑی میں سے اتر کر اندر آ رہے تھے۔ سمکی کو بادل ناخواستہ فون بند کر دینا پڑا۔

ڈولی کے بچے سمکی کے بچوں کے ساتھ ٹی وی پر کارٹون دیکھنے میں مشغول ہو گئے اور دونوں مائیں گزشتہ رات کی پارٹی پر تبصرہ کرنے لگیں۔

سمکی نے ڈولی کو وحید کے بارے میں سب کچھ بتادیا۔ وحید سے ہونے والی ٹیلیفون گفتگو بھی من وعن سنادی۔

اور شیرازی؟ ڈولی نے سوال کیا۔

آیا تھا اس کا فون بھی۔ آج تو میرا موڈ ہی نہیں بنا اس سے لمبی بات کرنے کا۔ یار بڑا بور لگتا ہے وہ وحید کے سامنے۔ وحید کتنا ذہین' ہینڈسم' دلچسپ شخص ہے۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ اس کی اور میری ذہنی سطح ایک سی ہے اور شیرازی...

خیر تمہیں اتنے تحفے دیتا ہے۔ روز نیا جوڑا' نیا پرفیوم تمہارے لیے باہر سے لا رہا ہوتا ہے' عمدہ ڈنر کھلاتا ہے ہم سب کو تمہاری وجہ سے۔ بے چارے کو ایسے مسترد بھی نہ کرو خیر۔ وہ مصنوعی ہمدردی سے بولی۔

ٹھیک ہے ٹھیک ہے! اسے کون سا کچھ کہہ رہی ہوں میں۔ اسے جوڑے دے کر جو خوشی ملتی ہے میں اس سے وہ خوشی نہیں چھینوں گی' اب اتنی ظالم بھی نہیں ہو سکتی۔ مجھ سے محبت کرتا ہے' کرتا رہے۔ اس کا دل میں کیسے توڑ سکتی ہوں لیکن ہائے جو وحید میں بات ہے' اس کا کوئی جواب نہیں۔

دونوں سہیلیاں ہنسنے لگیں۔

تھوڑی ہی دیر میں سمکی کا شوہر بھی جم خانہ سے لوٹ آیا۔ ڈولی کو کسی شادی میں جانا تھا۔ اس لیے اس نے جو انڈیا کی سلک کا جوڑا سمکی سے ادھار مانگنا تھا پہننے کیلیے وہ لیا اور رخصت ہو گئی۔

نعیم اور سمکی نے آج خلاف معمول کھانا بھی گھر پر بچوں کے ساتھ کھایا۔ ورنہ انہیں اس کا موقعہ ہی کہاں ملتا تھا۔ ہر رات تو کسی نہ کسی کے گھر کھانا ہوتا تھا یا گیٹ ٹو گیدر۔ اس لیے بچوں کو تو ملازمہ ہی کھانا دیا کرتی تھی۔

صبح بچوں کے سکول چلے جانے کے تقریباً دو گھنٹے بعد سمکی بیدار ہوئی۔ موسم ابر آلود ہو رہا تھا۔ اسے فوراً ہی وحید کا خیال آ گیا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر وہ لان میں چہل قدمی کرنے لگی۔ ہر پتہ' ہر پھول خوبصورت اور نیا نیا سا لگ رہا تھا ماحول بھی نکھرا ہوا تھا۔ آئی تھنک آئی ایم ان لو! سمکی نے گلابوں کی پتیاں نوچ کر ہوا میں اڑا دیں۔ کتنا مزا آ رہا تھا اسے وحید کے بارے میں سوچ کر۔ اس کے خیالات میں کھو جانے کو جی چاہ رہا تھا مگر ساڑھے دس بجے اسے اپنی ایروبکس Aerobics کی کلاس میں بھی جانا تھا۔

وہ اور اس کی سبھی سہیلیاں جسمانی فٹنس میں بہت یقین رکھتی تھیں اور پابندی سے جم میں جا کر ورزش کرتی ہیں۔

ان سب کا تقریباً روزانہ کا یہی معمول تھا صبح ایروبکس کلاس کے بعد بیوٹی پارلر جا کر فیشیل، تھریڈنگ یا ویکسنگ کرواتیں۔ پھر لبرٹی مارکیٹ کے پیچھے والی مارکیٹ میں بیٹھے درزیوں کے چکر لگاتیں۔

نئے سوٹوں پر رنگوں اور ڈیزائن کی مناسب سے لگوانے کے لیے ڈوریاں، فیتے، بٹن وغیرہ خریدنا بھی تو ایک مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ اس لیے صبح کا وقت انہی کاموں میں گزر جاتا۔ کبھی کبھار بیچ میں ایک آدھ سہیلی کے گھر مارننگ کافی پارٹی بھی آ جاتی۔ ورنہ ہر ماہ ایک کمیٹی پارٹی تو لازمی تھی۔ سب سہیلیوں نے مل جل کر "جسٹ فار فن" کمیٹی ڈال رکھی تھی۔ پھر جس کی کمیٹی نکلتی، وہ سب کو چائنیز میں ٹریٹ دیتی۔ خوب مزا رہتا۔

سمکی کو ٹیلر کی دکان پر سویٹی اور سالٹی مل گئیں۔

سویٹی چالیس کلیوں کا مرینہ کا کرتہ سلوا رہی تھی اور سالٹی کی، درزی سے اس کی سرخ شیشوں والی قمیض پر کندھے کے پیڈ ٹھیک سے نہ لگانے پر جھڑپ ہو رہی تھی۔

شام کو خوشنودہ کے گھر پارٹی تھی اور وہیں پر پہننے کے لیے یہ کپڑے ارجنٹ ریٹ پر سلوانے کے لیے اتنی مصیبت پیدا ہو رہی تھی۔

"یہ آج کل کے درزی اپنے آپ کو صدر بش سے کم نہیں سمجھتے!" سالٹی منہ پھلا کر آہستہ سے بڑبڑانے لگی۔

خوشنودہ کی پارٹی پر سبھی دوستوں نے جانا تھا کیونکہ خوشنودہ نے اپنا نیا شوہر سب سے پہلی بار متعارف کروانا تھا۔ خوشنودہ پورے گروپ میں سب سے انوکھا شوق رکھتی تھی نئی نئی شادیاں کرنے کا شوق۔ اس کے اسی شوق کی وجہ سے اس کی سہیلیوں نے اسے الزبتھ ٹیلر کا خطاب دے رکھا تھا۔

رات کو اس ڈنر پارٹی میں جانے کے لیے سب ہی بڑے مشتاق تھے کیونکہ اب کی بار خوشنودہ نے کوئی بہت ہی موٹا مرغا پھنسا تھا اور ہر وقت اس کی تعریفوں میں زمین آسمان کے قلابے ملاتی رہتی تھی۔

"اچھا بائے سی یو! شام کو پولو گراؤن میں ملیں گے! سویٹی سالٹی ہاتھ ہلاتی جوتوں کی ایک دکان میں گھس گئیں۔

شام کو پولو گراؤنڈ میں واک کرنا بھی سب سہیلیوں کا پسندیدہ شغل تھا۔ وہاں بچوں کو جھولے جھولنے کے لیے چھوڑ دیتیں اور خود جاگنگ شوز پہن کر گراؤنڈ کے چکر لگانا شروع کر دیتیں۔

وہاں لاہور کا بڑا ان کراؤڈ آتا تھا۔ نوجوان لڑکے لڑکیاں، تو ایک دوسرے کو بے تکلفی سے ہیلو! کہہ کر ٹیلی فون نمبروں کا تبادلہ کر

لیتے البتہ مڈل ایج گروپ ذرا چھپ چھپا کر یہ کام کرتا۔

پولوگراؤنڈ شام کو انسانوں کی منڈی کی طرح دکھتا۔ اس کے بارے میں یہ شہرت خاصی عام تھی کہ وہاں جا کر آپ کوئی ''دوست'' تلاش کرنے میں ضرور کامیاب ہو سکتے ہیں۔ باوقار چھڑی ہاتھ میں تھامے بوڑھے' دوسروں کی بیویاں تاکنے والے مرد' دل پھینک نوجوان' ڈھلتی ہوئی عمر والی عورتیں جن کے چہرے' امریکہ سے منگوائی ہوئی مہنگی اینٹی ایجنگ کریمیں ملنے کے باوجود جھریوں کی آمد کو نہیں روک سکتے' بلکہ ہر نئی جھری ایک نئے نروس بریک ڈاؤن کا پیش خیمہ بن جاتی ہے' سبھی پولوگراؤنڈ میں چہل قدمی کرنے آتے تھے۔ سمکی کا شام کو پولوگراؤنڈ جانے کا موڈ نہیں بنا۔ دراصل وہ خوشنودہ کی پارٹی میں ذرا آرام کر کے جانا چاہتی تھی۔ اگر وہاں چلی جاتی تو اس کی بیوٹی سلیپ پوری نہ ہونے کی وجہ سے اس کا چہرہ پارٹی میں آنا تھا۔ یہ سوچ کر اس کا من گنگنانے لگا۔ اور ذہن رات کو پہننے والے جوڑے کے انتخاب میں مصروف ہو گیا۔

نعیم کو دوپہر کی فلائٹ سے اسلام آباد جانا پڑ گیا تھا اور سمکی تھوڑی زیادہ فری محسوس کر رہی تھی۔ کیونکہ خاوند کے پارٹی میں موجود ہونے سے تھوڑا اسا ریزرو آخر رہنا ہی پڑتا ہے۔

پارٹی بہت شاندار تھی۔ خوشنودہ اپنا نیا مرغا لیے سب کو ہیلو ہائے کہتے نہ تھک رہی تھی۔ بجلی' خاوند کے موجود نہ ہونے کے ڈپریشن میں مسلسل گرفتار سگریٹ پہ سگریٹ سلگائے' ہلکا ہلکا ڈرنک کر رہی تھی۔ کبھی کبھار کسی بات پر بے اختیار ہو کر وہ بے ساختہ ایک آدھ قہقہہ بھی لگا دیتی۔

وحید' سمکی پر اپنی بھرپور توجہ نچھاور کر رہا تھا۔ ڈولی' حمیرا کے بھائی ٹونی کی محبت میں کسی صورت بھی گرفتار ہونے کے لیے تیار نہ تھی اس لیے ٹونی کے جھوٹے اظہار محبت کا جواب اسے اپنی بے نیازی سے دے رہی تھی۔ ابھی کچھ عرصے پہلے ہی تو وہ اچھی ہوئی تھی ورنہ زریں کے شاعر دیور شامی نے تو اسے اپنے شعر سنا سنا کر اچھی بھلی مریض عشق بنا دیا تھا۔

ٹونی! تمہیں معلوم ہے وحید صاحب آج کل اس بازار کے پرانے مکانوں کی وضع قطع اور تاریخ پر ریسرچ کر رہے ہیں!

ڈولی نے ٹونی کا دھیان ہٹانے کے لیے موضوع بدل دیا۔

کیا؟ واقعی؟ وحید صاحب کیا یہ سچ کہہ رہی ہیں؟ اس نے بے یقینی کے عالم میں پوچھا۔ سمکی اور بجلی بھی ہمہ تن گوش ہو گئیں۔

جی بالکل! وہ علاقہ بھی ہماری تاریخ کا حصہ ہے آخر۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ شاہی عمارتوں اور چکلوں میں اکثر و بیشتر مکانی قرب رہا ہے۔ اس لیے کہ بادشاہ مجروں کے شوقین اور طوائفوں کے دلدادہ ہوا کرتے تھے۔ ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کی

سب سے پہلا چکلہ محمد تغلق نے اپنی راجدھانی دولت آباد کے نزدیک طرب آباد کے نام سے قائم کیا۔ شہنشاہ اکبر نے آگرہ میں فتح پور سیکری کے پاس ان کے لیے شیطان پورہ آباد کیا۔ دہلی میں چاندنی چوک اور قلعہ معلی سے ملحق چاوڑی بازار تھا۔ لکھنو میں واجد علی شاہ نے طوائفوں کو اپنے محل سے نزدیک ترین رکھا ہوا تھا اور ہمارے شہر لاہور کو دیکھئے' شاہی قلعہ اور ہیرا منڈی میں چند ہی قدم کا فاصلہ ہے۔ ہیرا منڈی میں بہت سے مکانات تاریخی حیثیت کے حامل ہیں۔

ٹونی اور سب فرینڈز بڑے تجسس سے سن رہی تھیں۔

یار دیکھنا چاہئے کبھی جا کر!۔ ٹونی کے چہرے پر ایک عیاش طبع مرد کی سی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

ہائے دل تو بڑا چاہتا ہے مگر کیسے جائیں؟ وحید نے یوں سادگی سے پوچھا جیسے وہاں جانا کوئی معمولی بات ہو۔

کیا مطلب ہے؟ ہم کیوں جانے لگے بھلا اس گندی جگہ پر' توبہ توبہ! پوچھا جیسے وہاں جانا کوئی معمولی بات ہو۔

کیا مطلب ہے؟ ہم کیوں جانے لگے بھلا اس گندی جگہ پر' توبہ توبہ!

بجلی نے نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے نک بھوں چڑھائی۔

بھئی ویسے ہی! مشاہدے کے لیے بھی تو بندہ کبھی جا سکتا ہے آخر! اتنا محدود مشاہدہ بھی نہیں ہونا چاہیے۔ میرے خیال میں انسان کا! زندگی کے ہر پہلو پر نظر ڈال لینی چاہئے۔ اپنی دنیا سے باہر نکل بھی دیکھنا چاہئے کہ اس پار کے لوگ کس طرح زندگی بسر کرتے ہیں!

سب لوگ قائل سے ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

ویسے ایک بار ہم لوگوں نے خالی ڈرائیو کر کے ان گلیوں کو دیکھا تھا۔ یاد ہے سمکی' نعیم بھائی اور عرفان اللہ ساتھ لے گئے تھے ہمیں۔

ڈولی نے بھانڈا پھوڑ دیا۔

ہاں! بس ڈرائیو ہی کی تھی! اور تو کچھ نہیں کیا تھا!

سمکی جھٹ سے بولی۔

چلو یار ہو جائے! ٹونی نے تجویز پیش کی۔

کیا؟ وحید نے پوچھا۔

بھئی چلتے ہیں! ابھی رات جواں ہے۔ ذرا نظارہ کرتے ہیں۔ آخر مشاہدہ بھی تو کرنا ہے نا!

سب ہنسنے لگے۔

نہیں' نہیں مجھے تو بڑا ڈر لگتا ہے بھئی! خوشنود اپنے نئے میاں سے لاڈ سے چپک گئی۔

جس نے چلنا ہے چلے جس نے نہیں چلنا نہ چلے۔ ٹونی اٹھ کھڑا ہوا سمکی نے وحید کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

چلنا ہے؟ وہ سرگوشی کے انداز میں بولا۔

آپ کہیں اور ہم نہ آئیں ایسے کیسا ہو سکتا ہے؟ آپ ساتھ ہوں گے تو مجھے کوئی فکر غم نہیں۔

سمکی نے دل ہی دل میں شکر کیا کہ اس کا میاں شہر سے باہر گیا ہوا تھا ورنہ شاید تھوڑا بہت ہنگامہ کرتا' یا اسے جانے سے روک لیتا۔ کبھی کبھی وہ بہت اولڈ فیشنڈ لوگوں کی طرح قنوطی ہو جایا کرتا تھا۔

دو گاڑیوں میں جانے والے سوار ہوئے۔ باہر کی نرم' معطر ہوا کے شفیق لمس نے انہیں مزید شوخ بنا دیا۔ ٹونی بہت مچلا جا رہا تھا۔

بھئی ہم تو فارنر ہیں' ہمیں لاہور بائی نائٹ دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ آپ سب ہمیں سیر کروایئے! وہ بچوں کی طرح ضد کرنے لگا۔

ڈاکٹر وحید تو لاہور شہر کا چلتا پھرتا انسائیکلوپیڈیا ثابت ہو رہا تھا۔ اسے شہر کے بارے میں مکمل معلومات تھیں۔ پہلے اس نے سب کو مولا بخش کے مشہور و معروف پان کھلوائے' پھر گوالمنڈی کے قلفے کی دکان پر حملہ بول دیا۔

یو نو ٹونی! مزنگ میں چائے کی ایک ایسی دکان ہے جو آج تک کبھی بند نہیں ہوئی۔ یعنی جب ایک دکاندار تھک جاتا ہے تو دوسرا آ سنبھالتا ہے عام طور پر باپ بیٹا مل کر یہ کام کرتے ہیں۔

وحید نے ٹونی کو مزید حیرت زدہ کر دیا۔

ایسے ایور لاسٹنگ انسٹی ٹیوشنز کا تو ''گینز بک آف ورلڈ ریکارڈز'' میں ذکر ہونا چاہئے یار۔ ٹونی متاثر ہو کر بولا۔ وحید نے اس دکان کی چائے سب کو پلوائی تو سب اس چائے کی اعلیٰ کوالٹی کے بھی قائل ہو گئے۔

اگلا سٹاپ راوی دریا ہے۔ وحید نے اناؤنس کیا اور گاڑی پارک کرنے کے بعد وہ لوگ نیچے اتر آئے۔

راوی کے بارے میں بھی ہمیں کچھ بتائیں پلیز! ایک فرمائش آئی۔

اس دریا میں اب وہ شاہانہ پن کہاں جو ماضی میں اس کی لہروں میں چھپا جھلملاتا ہوا زیور ہوا کرتا تھا۔ اب تو یہ ایک اجڑی

ہوئی بیوہ کی مانند ویران ہو کر رہ گیا ہے۔ سکڑ کر یوں سمٹ کر رہ گیا ہے جس طرح کوئی ان چھوئی دوشیزہ اپنی عزت لٹ جانے کے بعد اپنی بچی کھچی عزت نفس کے چیتھڑے اپنے جسم پر لپیٹنے کی کوشش میں خود کو ناکام سا محسوس کر کے بے بسی کے گرداب میں پھنس کر رہ جاتی ہے۔ وقت بہت ظالم چیز ہے۔ ہر شے کو روند کر آگے بڑھ جاتا ہے۔

یار ڈپریس نہ کرو اور اگلی منزل پر لے چلو یعنی اصلی مقام پر! ٹونی اس اداسی سے بھری ہوئی کنٹری سے بور ہو چلا تھا۔

سب خوش ہو گئے اور اب گاڑیاں شاہی محلے کی طرف چل دیں۔

تنگ تنگ گلیوں اور اونچے چوباروں والا یہ عورت بازار' مردوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا نظر آتا تھا۔ زریں' سمکی' ڈولی' سبھی نے شریف عورتوں کی طرح اپنے دوپٹے سروں پر لے لیے۔ اور دھڑکتے ہوئے دلوں کے ساتھ ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا۔ گاڑی آہستہ آہستہ سڑک کے سینے پر رینگنے لگی۔

ہائے اللہ جی! کیسی جگہ ہے! انہوں نے بے یقینی کے عالم میں اوپر ایک چوبارے کی طرف نظریں دوڑائیں اور پھر دیکھا کہ مختلف مکانوں کی بالکونیاں ایک سا نظارہ پیش کر رہی تھیں۔

ہر بالکونی پر ایک ایک دو دو لڑکیاں کرسی ڈالے مجسمے بنی بیٹھی متجسس نگاہوں سے راہگیروں کو دعوت نظارہ دیتی نظر آ رہی تھیں۔ ان کے سروں پر دو دو سو پاور کے تیز بلب جگمگا رہے تھے' جس میں نہائی وہ سجی سجائی شوکیس میں سجی لذیذ مٹھائیاں لگتی تھیں۔ مٹھائیوں کی دکان میں سجی مٹھائیاں دیکھ کر کس کافر کا دل للچائے بغیر رہ سکتا ہے' اس لیے بالکونی کے نیچے کھڑے کتنے ہی درندے بھیڑیے اپنی رال ٹپکاتی تھوتھنیاں اوپر اٹھائے' اپنی غلیظ نظروں سے محض ونڈو شاپنگ کر کے ہی' دل کو خوش کر رہے تھے۔

کچھ بالکونیاں ایسی بھی تھیں جو مٹھائیوں کے بجائے چرغے کی دکان دکھائی دیتی تھیں۔ ان پر رسیوں سے لٹکی ہوئی' کھال کھنچی' چٹخارے دار مصالحے میں ڈوبی ہوئی' ننگی' روسٹ ہونے کو تیار مرغیاں' خریدار کو اپنی طرف کھینچتی نظر آ رہی تھیں۔

گندی عورتیں! کیوں ایسا غلیظ کام کرتی ہیں توبہ۔ بلی کو کراہت سی محسوس ہوئی۔

عذاب الٰہی نازل ہو گا ان پر! سمکی بھی استغفار کرنے لگی۔

کیا سین ہے یار! مزا آ گیا! ٹونی بہت انجوائے کر رہا تھا۔

مجھے تو بھوک لگی ہے اور سنا ہے یہاں کے پائے بہت مشہور ہیں۔

ٹونی ایک دکان پر "بچے کے پائے" لکھے دیکھ کر نیا شوشہ چھوڑ دیا۔

میری پارٹی سے کھاپی کر نہیں آئے کیا؟ خوشنودہ نے برا مناتے ہوئے کہا۔

بھئی اتنی سیر کے بعد اگر یہاں کے المشہور پائے نہ چکھے تو اس ایڈوانچر کا فائدہ؟ یا تو پھر آپ لوگ اور کچھ کھلا دیں تو میں کمپرومائز کرلوں گا۔ٹونی کھی کھی کرنے لگا اچھا؟

سب نے اسے گھور کر اس طرح دیکھا کہ وہ ڈھیٹ بن کر مذاقاً ان کے آگے ہاتھ جوڑنے لگا۔

نو پرابلم بھئی پنچھے کے پائے یہاں کی خاص ڈش ہے۔کوئی حرج نہیں کھالیتے ہیں۔

وحید کے کہنے پر سب لوگ گاڑی سے اتر کر دکان کے اندر چلے گئے اور تھوڑی دیر میں کھانا آ گیا۔تام چینی کی چھوٹی پلیٹوں میں پتلے سے شوربے میں ڈوبی ہوئی ایک ایک بوٹی اور نان ان کے سامنے رکھ دیے گئے۔ پینے کے لیے سٹیل کے جگ اور گلاس بھی بیرا بڑے اہتمام سے سیٹ کر کے رکھ گیا۔ برتن دیکھتے ہی خواتین نے عجیب وغریب نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

سلاد؟ حمیرا نے میز پر نظریں دوڑائیں۔

سلی گرل! یہاں صرف گوشت سرو کرتے ہیں! وحید نے اطلاعاً کہا۔

اچھا ذرا ٹشو ہی منگوادیں! اسمکی نے شوربے میں ڈوبی انگلیاں دیکھ کر بے چینی سے فرمائش کی۔

آپ کھانے کے بعد ادھر ہاتھ دھو سکتے ہیں جی۔نوکر نے ایک طرف لگے ہوئے واش بیسن کی طرف اشارہ کیا۔جس کی ایک طرف ہاتھ پونچھنے کے لیے سفید' میلا سا تولیہ بھی لٹک رہا تھا۔

Have fun ladies! ریلیکس اینڈ انجوائے دس پلیس۔ٹونی نے ہولے سے سرزنش کی اور سب سر جھکا کر کھانا کھانے میں مشغول ہوگئے۔

کھانا کھانے کے بعد مجبوراً اسی طریقے سے ہاتھ دھونے پڑے۔شکر ہے وہاں ڈھنگ کا صابن کم ازکم موجود تھا' مگر دھونے کے بعد جیسے ہی زریں نے تولیے کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ بجلی نے پاگلوں کی طرح نروس ہوکر ہلکی سی چیخ مار کر اسے پیچھے کھینچ لیا۔

ڈونٹ ٹچ اٹ! ایڈز ایڈز!!

''ہائے اللہ۔یو آر رائٹ''

ایک دبی دبی چیخ ان کے لبوں سے نکلی۔وہ یوں چونک کر اس تولیے سے دو دو گز دور ہوگئیں جس طرح وہ تولیہ بجلی کا تولیہ ہو۔

سب ہنس دیئے۔

اوہ کم آن لیڈیز! کیسے کیسے فوبیاز میں گرفتار ہیں آپ لوگ! اگر اتنا ہی خوف ہے تو چلیں واپس چلتے ہیں۔ میرا خیال ہے کافی سیر ہوگئی ہے ٹھیک ہے؟

ڈاکٹر وحید نے اپنے مخصوص دھیمے انداز میں بولا۔

السلام علیم ڈاکٹر صاحب! کیا حال چال ہیں جناب کافی دنوں بعد نظر آئے۔ آپ کا کام ختم ہوگیا کیا؟

نووارد نے آتے ہی کئی سوال کر ڈالے۔ ڈاکٹر وحید اس سے بڑی گرمجوشی سے ملا اور اپنے دوستوں سے اس کا تعارف کروانے لگا۔

یہ یہاں کے علاقہ کونسلر جناب ضمیر الدین ککے زئی ہیں۔ بہت اچھے شخص ہیں۔ ریسرچ کے دوران انہوں نے میری بہت مدد کی اور ہر طرح سے تعاون کیا۔ انہی کی وجہ سے میں ہیرا منڈی کی اصل تاریخی حیثیت کے بارے میں معلومات حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکا ہوں!

اچھا! اچھا! سب متاثر ہو کر دیکھنے لگے۔

گھر والے آئے ہیں شاید! بیبیاں کچھ کھائیں پئیں گی؟

اس نے مہمان نوازی کا حق ادا کرتے ہوئے پوچھا۔

نہیں نہیں ہم لوگ تو ابھی پائے کھا کر بیٹھے ہیں۔ شکریہ۔ یہ سب دوست ہیں۔ انہیں بہت تجسس تھا یہاں آ کر دیکھنے کا شوق تھا۔ اس لیے میں ان کی خواہش سے مجبور ہو کر انہیں یہاں لے آیا۔

وحید نے وضاحت کی۔

اچھا تو پھر آپ کے دوست تو ہمارے دوست بھی ہوئے کیا خاطر کی جائے آپ لوگوں کی؟ جا یار بوتلیں لے کر آ!

کونسلر نے اپنی ہیرے کی چمکتی انگوٹھی والا ہاتھ بڑھا کر ایک لڑکے کو پانچ سو کا نوٹ پکڑا دیا اور جلدی آنے کی تاکید کی۔

نہیں نہیں آپ تکلیف نہ کریں۔ شکریہ بہت بہت، بیلی جو بہت عقلمند تھی چپ نہ رہ سکی۔

تکلیف کیسے جی آپ ہمارے مہمان ہیں آپا جی۔ یہ تو کوئی بات ہی نہیں ڈاکٹر صاحب فرمایئے اور کوئی خدمت ہو تو؟

ہمیں ان کا ڈانس دیکھنے کا بہت شوق ہے! کیا ہمیں آپ کوئی مجرا دکھا سکتے ہیں کیونکہ ہم نے تو بس فلموں میں ہی دیکھ رکھا ہے۔

سمکی صاف جھوٹ بول گئی حالانکہ ابھی پچھلے ہی دنوں اس نے کسی ولیمے پر دو نوجوان رقاصاؤں کا مجرا دیکھا تھا جن کے بارے میں سنا تھا کہ وہ آج کل مارکیٹ میں ٹاپ پر جا رہی ہیں۔

ہاں جی! ہم دیکھنا چاہتے ہیں ان کے گھر' کیسے وہ سب کچھ کرتی ہیں؟ وہاں کا ماحول وغیرہ۔ یو نو! اگر ممکن ہو سکے تو... یعنی اگر آپ کو کوئی پرابلم نہ ہو تو.....

بجلی نے بڑے اخلاق سے بات کی۔

کمال کرتی ہیں آپا جی آپ! پرابلم یا تکلیف کی کونسی بات ہے اس میں۔ یہ میری اپنی قوم ہے جی... میری اپنی بچیاں ہیں۔ ہم فنکار لوگ ہیں جی۔

فن بیچ کر پیٹ پالتے ہیں فن کا مظاہرہ ہی ہماری زندگی ہے۔ میں آپ کو لے چلتا ہوں۔ آپ فکر ہی نہ کریں!

کونسلر بڑے فخر سے انہیں اپنے ساتھ لے کر چلنے لگا۔ راستے میں کچھ لوگوں نے سروں پر چادریں لیے فیشن ایبل عورتوں اور مردوں کو دیکھا تو چہ میگوئیاں شروع کر دیں۔

ہائے اللہ کتنا Emparrassing لگ رہا ہے! کہیں چھاپہ نہ پڑ جائے اور اخبار میں ہماری فوٹو نہ آ جائے کل صبح۔

ہمیشہ کی وہمی ڈولی نے اندیشہ ظاہر کیا۔

کیا بیوقوفیاں بک رہی ہیں آپ۔ تمہارا کیا مطلب ہے' ہم جیسوں کو کوئی وہ سمجھ سکتا ہے' دماغ تو نہیں چل گیا! توبہ ہے تم بھی کبھی کبھار بڑی عجیب بات کر دیتی ہو کہاں "ہم" کہاں وہ۔ توبہ اللہ معاف کرے' ان کے تو چہروں پر ہی پھٹکار پڑی ہوتی ہے۔ نحوست ماریاں۔

بجلی نے ڈولی کو چپ کروا دیا۔

گلیوں میں کھلتے دروازوں والی ہر مکان کی بیٹھک پر ایک پردہ پڑا ہوا تھا۔ جس میں سے باہر سے دیکھنے والے کو اندر کا کچھ ڈھکا' کچھ چھپا' نیم وا آنکھوں کا سا منظر دکھائی دے رہا تھا۔

یہ پردے؟ بجلی نے پھر سوال کیا؟

آپا جی پردہ نہ ڈالیں تو پولیس فحاشی کا الزام لگا دیتی ہے۔ اور اگر مکمل طور پر پردہ ڈال کر رکھیں تو گاہک کو کیسے معلوم ہو کہ اندر والی کیسی ہے؟ جی بزنس کے لیے ان باتوں کا بڑا خیال رکھنا پڑتا ہے ہم لوگوں کو!

اس نے بڑے کاروباری انداز میں جواب دیا۔

کونسلر نے کچھ ہی دیر میں انہیں ایک دو منزلہ مکان کے آگے لے جا کر کھڑا کر دیا۔ یہ سندری اور مندری کا کوٹھا ہے۔ آجکل یہ بھی بہت پاپولر ہیں۔ دونوں بہنوں نے فن کی بلندیوں کو چھو لیا ہے۔ آپ دیکھیں گے تو بہت پسند کریں گے۔

وہ انہیں مکان کے اندر لے گیا۔ مگر ایک منٹ پر باہر رکنے کا اشارہ کیا۔ بیٹھک میں ان کے داخل ہونے سے پہلے وہ خود شاید ان کے بارے میں اندر والیوں کو کچھ بتانا چاہتا تھا۔ اندر سے ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں۔ ایک دو بار یہ فقرہ بھی کان میں پڑا۔

شریف آئے ہیں! بوتلیں منگواؤ!

ہائے اللہ ناٹ اگین! بوتلیں پی پی کر تو میرا حشر ہو گیا ہے۔

ڈولی نے برا سا منہ بنایا۔

بھئی ہم VIP ہیں آخر۔ زریں نے فخریہ انداز میں کہا۔

اسی لمحے گلی کے ایک کونے والے ویڈیو سنٹر سے اونچی آواز میں انگلش گانوں کی کیسٹ بجنے لگی۔

She works hard for the money
So you better treat her right

امریکی پاپ سنگر ڈونا سمر اپنے مخصوص انداز میں پر جوش طریقے سے گا رہی تھی۔

اوئی اوئی ویڈیو سنٹر! بجلی نے بلند آواز میں ویڈیو سنٹر کا نام پڑھا اور سب زیر لب مسکرا دیئے۔

آیئے جی اندر۔ کونسلر انہیں بڑی عزت سے اندر لے گیا۔ اندر ایک بڑی عمر کی عورت اور دو نوجوان لڑکیاں کمرے میں موجود تھیں۔

سلام علیکم جی! سب نے ایک دوسرے کو سلام کیا۔

ٹونی اور وحید بڑے خوش نظر آنے لگے۔ اور کیوں نہ آتے 'لڑکیاں دونوں بہنیں نوجوان' تر و تازہ اور انداز سے مہذب دکھائی دیتی تھیں۔ سندری اپنے نام کی طرح سندر تھی۔ سرخ و سفید رنگت' تیکھے نقوش' لانبے سیاہ بال اور پتلی کمر اسے بہت پر کشش بنائے دے رہی تھی۔

مندری ذرا مختلف تھی۔ اس کا رنگ گندمی مائل اور نقوش کچھ ایسے غیر معمولی تو نہیں تھے مگر اس میں جسمانی کشش بدرجۂ اتم موجود تھی۔ جب وہ اپنے شانے تک کٹے ہوئے سیاہ بالوں کو سٹائل سے جھٹکا دیتی تو اس پر ماضی کی اداکارہ نیلو کا گمان ہونے لگتا۔

ان کی ماں' بروکیڈ کے چمکدار گاؤ تکیوں سے ٹیک لگائے' پان چباتے' سازندوں کو اپنے سر ٹھیک کرتے دیکھ رہی تھی۔ ہارمونیم اور طبلے سیٹ کئے جا رہے تھے۔ مگر موسیقی کے بجائے ہارمونیم سے درد بھری چیخیں' اور ٹھونکے جانے والے طبلوں سے دل کی دھڑکنیں' ایک دھمک کے ساتھ ابل ابل کر باہر کو ایسے نکلتیں کہ در و دیوار لرزنے لگتے۔ اور سوالیہ نشان پرانی سفیدی کی طرح اکھڑ اکھڑ کر نیچے گرنے لگتے۔ ایک عجیب سی افسردگی اور بے حسی کا وجود اس کمرے میں اپنی پوری طاقت کے ساتھ موجود تھا۔ چند ہی لمحوں میں بوتلیں آ گئیں۔ چار و ناچار سب کو پینا پڑیں ورنہ میزبانوں کی دل شکنی ہوتی۔

ابھی ساز سیٹ ہی ہو رہے تھے کہ مندری' جو شاید بڑی بہن تھی' اٹھ کر ایک کھڑکی نما دروازے سے گھر کے اندر چلی گئی۔

سمکی کی نظروں نے اس کا تعاقب کیا مگر کھڑکی سے کچھ نظر نہ آتا تھا کیونکہ اس کے آگے ایک موٹا سا پردہ لگا ہوا تھا۔

یہ اب شروع کیوں نہیں کر دیتیں؟

مہمان خواتین نے کسمسانا شروع کر دیا۔

کیا یہ لڑکی نین تارا تھی؟ سمکی نے نین تارا نامی رقاصہ کے بارے میں بہت سن رکھا تھا۔ اسے شاید اب تک ان دونوں لڑکیوں کے نام معلوم نہیں ہوئے تھے۔

نہیں جی' نین تارا تو فلموں میں چلی گئی ہے۔ یہ بھی بہت فریش پیس ہیں جی! کونسلر کھی کھی کرنے لگا۔

لاحول ولا قوۃ! ببلی کو کوفت ہونے لگی تھی اس قسم کے انداز گفتگو سے۔

دراصل جناب ابھی آفس کے ٹائم میں کچھ وقت رہتا ہے! اور باجی ٹائم سے پہلے کام نہیں شروع کرتیں۔

سندری نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

آفس! خواتین کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

جی ہاں آپا جی' یہاں کے کام کے اوقات گیارہ بجے سے ایک بجے ہیں۔ انہی اوقات کے دوران ہی کام کیا جاتا ہے۔ اور ابھی گیارہ بجنے میں پانچ منٹ ہیں' بس وہ اندر سے آتی ہی ہوں گی۔

گلی میں کھلی کھڑکی میں سے انہوں نے کئی گاڑیاں آتی دیکھیں جن میں بھڑکیلے کپڑے پہنے فل میک اپ کئے خواتین بیٹھی تھیں۔ گاڑی کسی مکان کے آگے رکتی عورت اترتی اور بیٹھک کے اندر چلی جاتی۔ یہ وہ تھیں جنہوں نے اپنی رہائش شہر کے معزز علاقوں مثلاً گلبرک' علامہ اقبال ٹاؤن' ماڈل ٹاؤن میں رکھی ہوئی تھی مگر صرف کام کی غرض سے آفس ٹائم میں ہی ہیرا منڈی میں آتی

تھیں۔

گیارہ بجتے ہی موسیقی شروع ہوگئی۔ پردے گرادیے گئے' سندری نے گھنگھرو پہن لیے اور نغمہ شروع کردیا۔

''دھیرے دھیرے میری زندگی میں انا۔دھیرے دھیرے میرے دل کو چرانا۔''

رقص شروع ہوگیا مگر مندری کچھ دیر بعد آئی اور بہن کے ساتھ مل کر گانا اور رقص کرنا شروع کردیا۔

''دیر سے کیوں آئی ہے؟ غالباً اندر بھی کسی کو اٹینڈ کررہی ہوگی!''

زریں اور بجلی سرگوشیوں میں طنز کرنے لگیں۔ سمکی نے دردیدہ نگاہوں سے وحید کو تاکا۔شکر ہے وہ رقاصہ کو نہیں بلکہ اسی کو معنی خیز نظروں سے دیکھ کر گیت کو انجوائے کررہا تھا۔سمکی کے دل میں اک ہوک سی اٹھی۔دھیرے دھیرے میری زندگی میں آنا۔

مندری کے چہرے پر ایک سچی لگن سے کام کرنے والے ذمہ دار ورکر کا سا تاثر تھا۔سندری البتہ الہڑ اور شوخ دکھتی تھی۔اس کے انداز اور ادائیں اس کی کم عمری اور ذہنی ناپختگی کی چغلی کھاتی تھیں۔

ایک گانے کے بعد انہوں نے دوسرا فلمی گانا شروع کردیا۔

''میں تیری دشمن' دشمن تو میرا۔میں ناگن تو سپیرا!''

''توبہ کتنا گھٹیا گانا ہے!''

اور کتنا غلیظ ماحول ہے... ان عورتوں کو تو شرم وحیا پاس سے بھی نہیں چھو کر گزری.... کس طرح نوٹ سمیٹتی ہیں اپنے جسم کی نمائش کرکرکے!''

عورتوں میں حسب عادت بدخوئیاں شروع ہوچکی تھیں۔ٹونی نے ان کے تیور محسوس کرکے انہیں آنکھوں ہی آنکھوں میں سرزنش کی کیونکہ وہ تو اس ناچ گانے سے بھرپور لطف اٹھارہا تھا۔کہاں نیویارک اور لندن کی ریڈلائٹ ایریا کی طوائفیں اور کہاں یہ رقص وموسیقی۔

''یار ہمارے مشرق میں ہر چیز ہوتی ہے مگر ہوتی ذرا اسٹائل سے ہے! ہے نا؟''

اس نے وحید کے کان میں دھیرے سے سرگوشی کی۔

نغموں کی لے اور بول بدلتے جارہے تھے مگر جسم وہی تھے۔وہ ہر تان پر تھرکنا' لچکنا بخوبی جانتے تھے۔

''ارے کسی کو بھیج کر اچھے سے پان منگواؤ شریف آئے ہیں!''

لڑکیوں کی ماں نے ایک سازندے کو ایک گانا ختم ہوتے ہی آرڈر دیا۔ بجلی کو یہ سن کر غرور سے نشہ سا آ گیا۔

اس سے پہلے کہ نیا گانا شروع ہوتا ایک ملازم نے مندری کے کان میں آ کر کچھ کہا۔ مندری نے فوراً اپنے پاؤں کے گھنگھرو اتارے اور کمر کے گرد بندھا دوپٹہ ڈھیلا کرنا شروع کر دیا۔

مہمانوں نے استفہامیہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اپنی نظروں میں ایک دوسرے کو جواب بھی دے دیا۔ یقیناً اندر کوئی موجود تھا۔ جو یہ پھر چل پڑی تھی۔

''بھئی یہ عورتیں پکی پروفیشنل ہیں۔ کمائی کا کوئی بھی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتیں۔ اب دیکھو یہاں سے ناچ کر بھی کما رہی ہیں اور پردے کے پیچھے دیوار کے اس پار بھی اپنے دام کھرے کرنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دے رہیں۔ ویسے آئی ریسپکٹ دیئر پروفیشنل ازم! ڈولی نے بجلی کے کان میں کہا۔

سندری نے ایک دو گانوں پر اکیلے ہی ڈانس کیا پھر کچھ دیر بعد تھک کر ستانے کے لیے بیٹھ گئی۔ نہ جانے مندری آنے میں اتنی دیر کیوں لگا رہی تھی۔

''میں تو بور ہو رہی ہوں۔''

اور میرا دم گھٹنے لگا ہے اس ماحول میں' لگتا ہے ہارٹ اٹیک ہو جائے گا مجھے تو!

توبہ ہمارا مذہب کس طرح پامال ہو رہا ہے یہاں پر! اللہ میری توبہ!

مجھے تو ابکائی آ رہی ہے۔

بھئی مجھ میں تو اور فحاشی دیکھنے کی تاب نہیں Lets Go

مہمان خواتین آپس میں اظہار خیال کر کے اٹھنے لگیں۔

''باجی! وہ لوگ جا رہے ہیں!'' سندری نے پردے کے قریب منہ لے جا کر کہا ایک لحظے کو خاموشی رہی پھر سندری بھی اندر کو چل دی۔

بہت مصروف ہوگی۔ رہنے دو بھئی! بجلی طنزیہ لہجے میں مسکرائی۔

بڑی بدتمیز اور گھٹیا ہے سستی عورت۔ اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ ہم لوگوں کو جانے سے پہلے شکریہ اور سلام کر کے رخصت کرے۔ آخر پیسے دیئے ہیں! مفت تو ناچ نہیں دیکھا ان کا۔

خوشنودہ نے توہین محسوس کرتے ہوئے ناک بھوں چڑھائی۔ اور سب سیڑھیاں اترنے لگے۔

سندری دوبارہ باہر نکل آئی اور انہیں جاتا ہوا دیکھنے لگی۔

خوشنودہ کے اندر تجسس اور حقارت نے یکایک ڈھٹائی آمیز جرات پیدا کردی۔

سیڑھیاں اترنے سے پہلے کھڑکی نما دروازے کے پاس گزرتے ہوئے وہ سب کی نظریں بچا کر پردے کا کونہ سرکائے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ آخر وہ کون سا ایسا عاشق تھا جس کی خاطر وہ بار بار اندر جارہی تھی اور آخر میں تو اندر جا کر بیٹھ ہی گئی تھی۔

مگر اندر کا نظارہ اس کی توقع کے بالکل خلاف نکلا۔ اس کی نظریں ٹھٹھک کر رہ گئیں۔ کمزور پاور کی زرد بیماری روشنی میں نہائے گدلے پانی جیسے مٹیالے کمرے میں بچھی چارپائیوں پر آڑے ترچھے لیٹے کچھ افراد سو رہے تھے۔ کسی کسی چارپائی پر بچوں کے کچھے بھی بے خبر پڑے تھے۔ لیکن ایک بچہ کچھے سے علیحدہ بلب کے عین نیچے کتابیں لیے بیٹھا تھا۔

اس کے ساتھ اس کی ماں بھی اس کی کتابوں پر جھکی ہوئی اسے کچھ پڑھ کر سنا رہی تھیں۔ ماں نے فوراً پردہ اٹھا کر جھانکنے والی کو دیکھ لیا اور معذرتانہ انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

سوری جی! آپ لوگ جا رہے ہیں! پھر کبھی آیئے نا۔ دراصل صبح اس کا ٹیسٹ ہے اور میرے بغیر اسے کوئی ٹیسٹ یاد نہیں کروا سکتا! انگلش کا بڑا مشکل ٹیسٹ ہے اسی لیے میں اسے یاد کروا رہی تھی آپ کو تو پتہ ہے جب تک بچوں کے ساتھ خود نہ لگو کہاں پڑھتے ہیں آپ کچھ اور بیٹھتے بس میں آ ہی رہی تھی!'' خوشنودہ جلدی جلدی سیڑھیاں اترنے لگی اب اس کا واقعی دم گھٹنے لگا تھا۔



تھوڑی سی تنہائی

''کیا کروں یار۔ بڑی مصیبت پڑ گئی ہے'' مونا کی آواز سے جھنجلاہٹ صاف عیاں تھی۔

''کیوں؟'' فون کی دوسری طرف سے شبو کی آواز آئی۔

''ہونا کیا ہے۔ وہ آپا کی کوٹھی کے اوپر والا ہے نا.... سمیع!''

وہ کرایہ دار؟

ہاں ہاں وہی!

کیا کیا اس نے؟

کرنا کیا تھا... بس عاشق ہو گیا ہے اور کیا!

دونوں طرف سے ہنسی کی پھلجھڑیاں چھوٹنے لگیں۔

اچھا تو اس میں اتنا گھبرانے کی کیا ضرورت ہے؟ آپ تو عادی ہیں اس بات کی۔ آپ پر تو لوگ ہمیشہ عاشق ہوتے چلے آئے ہیں.... ریلیکس اینڈ انجوائے اٹ!

نہیں بھئی میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔ ایک تو وہ وقت بے وقت فون کر دیتا ہے۔ نہ سوچتا ہے نہ سمجھتا ہے۔ تم کو تو پتہ ہے میں کس طرح سے مصروف ہوں۔ اور اگر منہاس کے کانوں میں بھنک بھی پڑ گئی کہ میں کسی سے فون پر بات کر لیتی ہوں تو پھر میری خیر نہیں۔ حسد کے مارے فوراً ہی گنڈاسے والا سلطان راہی بن جاتا ہے۔ جسم پر ازمنہ قدیم کے ڈیناسور کی طرح کانٹے اگ آتے ہیں اور بس.... ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔

اللہ!

ہنسی میں قہقہے شامل ہو گئے۔

اچھا بائی دی وے وہ ہے کیسا... سمیع' کرایہ دار؟

لکس میں تولا جواب ہے۔ بڑا ہینڈسم ہے ایمان سے۔

سچ؟

ہاں تو اور کیا.... صحت مند‘ متوازن جسم.... بڑی بڑی آنکھیں کالی کالی مونچھوں کی موٹی سی تہ.... سفید‘ چمکتے دانت‘ جیسے ٹوتھ پیسٹ کے اشتہار کے لیے بنے ہوں۔

اور عمر؟

ارے بھئی ٹھیک ہے۔ مشکل سے اٹھائیس انتیس کا ہوگا۔ سب سے اچھی بات یہ کہ مائل بہ کرم ہے۔

تو پھر آپ کو کیا تکلیف دیتا ہے؟ کہتا کیا ہے؟

کہتا کچھ نہیں۔ ابھی تو صرف کبھی کبھار ٹیلی فون ہی کر دیتا ہے اور بڑے مہذب انداز میں اپنی پسندیدگی کے ہلکے سے اشارے دیتا ہے۔ کھل کر نہیں کہتا۔

ہوں! دلچسپ کیس معلوم ہوتا ہے۔ بھئی تو بات کر لینے دیا کرو نا۔ حرج کیا ہے؟

نہیں یار! اسے امید بندھ جائے گی اور میں قطعاً انٹرسٹڈ نہیں ہوں۔

اچھا!

تیرا فون نمبر دے دوں؟

جی نہیں‘ ہرگز نہیں۔ مجھ سے پہلے نہیں سنبھالے جا رہے‘ آپ مجھ پر مزید بوجھ لادنے کا سوچ رہی ہیں۔ یہاں تو نو ویکنسی کا بورڈ لگا ہوا ہے جناب! ارے یار‘ ایسا کرتے ہیں.... ایک کام کرتے ہیں.... اسے عالیہ کا فون نمبر دے دیتے ہیں۔

اوہ تمہاری وہ سہیلی! بڑی پھسپھسی ہے یار۔ جسم کے ساتھ ساتھ اس کا ذہن بھی مریل سا ہے... سوکھی سڑی! سانولی رنگت پر اتنے گہرے رنگ کے کپڑے پہنتی اور جامنی شیڈ کی لپ سٹک لگاتی ہے۔ سمیع کو ہرگز پسند نہیں آئے گی۔

بھئی اس نے کون سی دیکھ رکھی ہے۔

ہاں لیکن مشکل یہ ہے کہ میں نے اسے ایک دوبار کہا کہ کسی اپنی ہم عمر یا کالج گرل سے دوستی کرے تو کہنے لگا۔ آپ کا کیا خیال ہے‘ مجھے لڑکیوں کی کمی ہے؟ جی نہیں؟ مجھے صرف آپ کی شخصیت سے دلچسپی ہے۔ آپ اپنے مشورے اپنے پاس رکھیں۔ تھینک یو ویری مچ۔“

سبحان اللہ! کیا بوسیدہ لائن ہے۔ شخصیت میں دلچسپی والی! ان عاشقوں کو ایک ریفریشر کورس دینا چاہیے عشق کرنے کے لیے' جس میں کچھ اس طرح کی باتیں ہوں کہ مجھے آپ کے ڈش انٹینا میں دلچسپی ہے' یا موبائل فون کے بغیر زندگی ادھوری سی محسوس ہوتی تھی اور جب سے آپ کے ساتھ موبائل فون پر گفتگو کرنا شروع کی ہے میری ذات کے کچھ ایسے پہلو مجھ پر آشکارا ہوئے ہیں کہ میں حیران سا ہو کر رہ گیا ہوں' وغیرہ وغیرہ۔

ہنسی کی بارش پھر ہونے لگی۔

نہیں ویسے آئی ایم سیریس۔ عالیہ کا کیس بہت توجہ طلب ہے۔ بے چاری بہت تھڑی ہوئی ہے۔ اس کی زندگی میں سوائے گھر' شوہر بچوں کے کچھ نہیں۔ یو نو' کتنا خالی پن ہوتا ہے زندگی میں جب کوئی چاہنے والا نہ ہو۔ زندگی کی بے رحم موجوں کا مقابلہ کرتے کرتے ہم تھک جاتے ہیں' لیکن اس کے باوجود سفر کرتے رہتے ہیں۔ ہمارے اندر یہ خواہش بھی زندہ رہتی ہے کہ ہمیں سہارا دینے والا' آسودگی بخش ہمارا ایک ننھا سے پرائیویٹ جزیرہ بھی ہمارے پاس ہو جہاں ہم سر چھپا سکیں۔

لیکن عالیہ فارغ تو نہیں۔ اس کی تو بوتیک بھی ہے۔ اسے مصروف رکھنے کے لیے۔ اور اس کا میاں بھی سنا ہے اس کا دیوانہ ہے۔

ہاں لیکن میاں تو سال میں چھ ماہ جرمنی میں گزارتا ہے اس کا آدھا بزنس وہاں ہے۔ اور آدھا یہاں۔ عالیہ کو تنہائی کی وجہ سے شدید ڈپریشن کے دورے پڑتے ہیں۔ گاڑی لے کر اکیلی آدھی آدھی رات کو ویرانوں میں نکل جاتی ہے۔ شی از ویری لونلی بھی۔ ابھی کل پرسوں ہی میری اس سے بات ہوئی تو مجھے بتانے لگی کہ پچھلے کچھ دنوں سے وہ بہت اداس اور پریشان ہے۔ ایک واقعے نے اس کی ایگو بہت بری طرح ہرٹ کی۔

کیا ہوا؟

ہوا یہ کہ سکول پر بچے چھوڑنے پک اپ کرنے میں ایک ابو جان سے مسکراہٹوں کا کچھ دنوں سے تبادلہ ہو رہا تھا۔ کہیں رک کر ایک دوسرے سے فون نمبر لیے گئے۔ فون پر کچھ دن بات چیت کا رشتہ ڈیولپ ہو جانے کے بعد ملاقات کا مرحلہ ہوا۔ عالیہ بڑی خوش تھی۔ اسے اپنی زندگی میں ایک نئی امنگ پیدا ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ سارا دن کپڑوں کا انتخاب کرنے میں گزرا۔ جب ریستوران میں کافی پیتے ہوئے عالیہ نے سگریٹ لگایا تو بزرگوار کے تیور بدل گئے۔ کہنے لگا۔ سموکنگ کرنے والی خواتین مجھے ٹرن آف کر دیتی ہیں۔ اس دن کے بعد اس نے فون تک نہیں کیا۔ عالیہ تو ہمیشہ سے چین سموکر رہی ہے۔ اس واقعے سے اتنی دل برداشتہ

ہوگئی ہے کہ گھنٹوں وائلیم لے کر سوتی رہتی ہے۔

چچ۔چچ۔ بے چاری! واقعی اسے کسی کی ضرورت ہے۔ بہت تنہا ہے وہ تھنک! ہاؤ سیڈ!! ہاں ٹھیک ہے سمیع کے ساتھ اس کی دوستی کروادیتے ہیں۔ دونوں آپس میں گپ شپ کریں۔ ایک دوسرے کا دل بہلائیں۔ ہمیں کیا؟ اچھا ہے۔ کارخیر ہے یہ تو' اچھا۔ اس کا نمبرلو۔ نمبر لکھوا یا گیا۔ اچھا لیکن سمیع کو فون نمبر دے کر یہ نہ کہنا کہ یہ لڑکی بڑی تنہا اور متلاشی ہے۔ کسی کی دوستی کے لیے مرری ہے۔ وہ اسے کہے کہ میں نے آپ کو سکول کے آگے بچوں کو لاتے لے جاتے کئی بار دیکھا ہے۔ اور آپ کی شخصیت میرے دل میں گھر کر گئی ہے۔ بڑی مشکل سے آپ کا فون نمبر حاصل کیا ہے' وغیرہ وغیرہ تاکہ اس کی انا کی ساکھ دوبارہ بحال ہوسکے ورنہ اگر اسے پتا لگا کہ ہم نے خیرات کے طور پر یہ میچ میکنگ کی ہے تو۔

ہاں ہاں پتا ہے۔ اس کی انا کا مسئلہ ہے.... لیکن یار! وہ یہ کیسے اسے کہے گا کہ وہ سکول کے پاس اسے دیکھتا رہتا ہے۔ اس کے تو بچے ہی نہیں ہیں نا!

ہاں یہ بات تو ہے۔

کہہ دے میرا گھر سکول کے پاس ہے۔

لیکن وہ تو مزنگ چونگی کی ایک بلڈنگ میں اوپر کے پورشن کا کرایہ دار ہے۔

اچھا وہ کام کیا کرتا ہے بھلا؟ تم نے یہ بتایا ہی نہیں۔

بھئی اخبار میں رپورٹر ہے۔ بتایا ہوگا۔

ایک لمحے کے لیے خاموشی کی سرد ہوا کا جھونکا سا آیا۔

اچھا! رپورٹر!! آواز میں ڈھیلا پن ہوگیا۔ اس کے پاس گاڑی ہے؟

گاڑی؟ نہیں تو... میرا خیال ہے' موٹر سائیکل ہے۔

''موٹر سائیکل یہ تو گڑبڑ ہوگئی ہے۔''

''کیوں؟ دوستی سمیع سے کرنا ہے یا اس کی موٹر سائیکل سے؟''

بھئی سمجھا کرو۔ فون پر بات ہوگی۔ بات آگے چلے گی۔ وہ توقع کرے گی کہ دونوں باہر جائیں' کھانے وانے کھائیں' لانگ ڈرائیوز پر جائیں' راستے میں میوزک سنیں... بولو!You Know

میرا خیال ہے عالیہ کا نمبر سمیع کو نہ ہی دیں۔ اگر اسے پتا لگا کہ ایک موٹر سائیکل والا اس میں انٹرسٹڈ ہو رہا ہے تو اس کی ایگو کتنی ہرٹ ہوگی۔ اب وہ اتنی تنہا بھی نہیں۔



نئی دستک

انگریزی فلم کا ''لوسین'' بہت دلچسپ تھا۔

ہیرو مائیکل اپنی ہیروئن لزا کے قریب ہونے کا خواہشمند تھا لیکن لزا ابھی تک تیار نہیں ہوئی تھی۔ دراصل وہ ایک ماڈرن' مغربی' جدت پسند لڑکی تھی۔ اسے عام روایتی قسم کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

مائیکل اسے مائل کرنے کے لیے ہر حربہ استعمال کر چکا تھا۔ خوبصورت میٹھی سرگوشیوں کا شہد اس کے کانوں میں انڈیلنے کے بعد وہ اسے خوبصورت ٹیولپ پھولوں کا تحفہ بھی پیش کر چکا تھا۔ کمرے کی فضا نیم تاریکی اور دلفریب پیانو میوزک کی وجہ سے بہت رومانی ہو چکی تھی۔ بیڈ کے ساتھ والی میز پر Russell Stover برانڈ کا قیمتی چاکلیٹ کا ڈبہ' اپنے سنہرے فیتے کے کھلنے کا انتظار میں نہ جانے کب سے پڑا تھا۔

مگر لزا کسی چیز سے متاثر ہوتی نظر نہ آ رہی تھی۔ وہ بیڈ روم کے بجائے کھلے آسمان تلے' یا جنگل میں لگائے گئے خیمے' میں زیادہ رومانویت محسوس کرنے والی لڑکی تھی۔ اسے محبت میں بے حجاب وحشت اور زیر کر دینے والی مردانہ خصوصیات ہی ٹرن آن کرتی تھیں۔ جدت ہی اس کے سوئے ہوئے جذبات میں جدت پیدا کر سکتی تھی کیونکہ وہ بہت جلدی بور ہو جانے والے لوگوں میں سے تھی۔

مائیکل نے اس کی خواہش کے مطابق اس سے درشتی سے پیش آنا شروع کر دیا۔ اور لذت اور اذیت کا ایک دلچسپ کھیل سکرین پر پیش کیا جانے لگا۔

میجر سعید کے جسم پر چونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ چہرہ تپ اٹھا اور ہاتھ پسینے سے تر ہو گئے۔ اس نے ایک دو انگریزی رسالوں میں Sado Maso chism کے بارے میں مضامین تو پڑھ رکھے تھے مگر فلم میں یہ سب کچھ دیکھنے کا اس کا پہلا موقعہ تھا۔

وی سی آر بند کر کے وہ کتنی ہی دیر اندھیرے میں اپنے بستر پر بیٹھا خلا میں گھورتا رہا' سوچتا رہا۔

اس کے پہلو میں اس کی سال بھر پرانی لاڈلی بیوی شہلا بے خبر سو رہی تھی۔ شہلا کو ایک تو اس قسم کی فلمیں دیکھنے کا ویسے ہی شوق

نہیں تھا پھر رات کے وقت تو وہ کوئی شریفانہ فلم بھی نہیں دیکھ سکتی تھی کیونکہ اسے کھٹ سے نیند آ جایا کرتی تھی۔ ایک بار سعید نے اسے زبردستی رات کو جگائے رکھا اور اپنے ساتھ فلم دیکھنے پر مجبور کیا تو وہ پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ گئی۔

آخر تم کیوں نہیں میرے ساتھ یہ فلمیں شیئر کر سکتیں؟ اور لوگوں کی بیویاں بھی تو ہیں وہ تو میاں کے ساتھ برابر دیکھتی ہیں؟ تمہیں کیا تکلیف ہے؟

دیکھو جانو! میں ایک خوبصورت بات کو مسخ ہوتے دیکھ کر اگر انجوائے نہیں کرتی تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ اب میرا منہ نہ کھلوائیں' ان فلموں میں سوائے عریانی' فحاشی اور سستی جذبائیت کے اور ہوتا ہی کیا ہے۔ بالکل جانور لگتے ہیں لوگ! بس مجھے آپ قائل نہیں کر سکتے! اس لیے چپ ہو جائیں تو بہتر ہے۔

شہلا اپنے عقائد کے بارے میں بہت پختہ رویہ رکھتی تھی' اور اتنی آسانی سے قائل ہو جانے والی نہیں تھی۔

سعید لاجواب ہو گیا اور غصے سے منہ پھلا لیا۔

شہلا نرم پڑ گئی۔ دیکھو سعید! جسمانی رشتہ تو عبادت کی طرح پوتر ہوتا ہے۔ میں اس کی اہمیت سے انکار نہیں کرتی مگر ان فلموں میں اسے اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ اس میں سے اس کی ساری لطافت' نزاکت اور نفاست غائب کر دی جاتی ہے۔ جب ایک پیارا سا حقیقی کومل سا جذبہ یوں مصنوعی بن کر مشین سے کمتر کر ضائع کر دیا جاتا ہے تو مجھے اس کی ہتک اور ذلت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ سوری' مگر مجھے یہ سب اپنے جمالیاتی ذوق کی توہین کرتا محسوس ہوتا ہے۔ میں مجبور ہوں۔ مجھے نہ کہا کرو بس! اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

سعید چپ ہو گیا مگر اس کی سوچیں اسے ایک مزید تیز تر ہائی وے پر دوڑانے لگیں۔ آخر اس کی بیوی نے اسے یہ احساس کبھی کیوں نہیں کروایا تھا کہ اسے کیا اچھا لگتا ہے؟ کونسی بات اس وقت اپیل کرتی اور آن کرتی ہے۔ جوں جوں وہ سوچتا گیا اسے یہ بات اور شدت سے محسوس ہونے لگی کہ شاید شہلا کبھی بھی خواہش مند نہیں ہوتی تھی۔

وہ عام سی روایتی مشرقی عورت نہیں تھی۔ اسے ہر بات کا پتہ اور شعور تھا' آ گہی تھی۔ اظہار بھی آتا تھا مگر اس معاملے میں وہ ہمیشہ سے Passive رہتی تھی۔ جب شوہر نے چاہا' ہاتھ بڑھا دیا اور شہلا نے تھام لیا۔ جب اس نے نہ چاہا' ہاتھ اپنے پاس رکھا' خود نہ بڑھایا۔ نہ چل کر آتی اور نہ جھولی پھیلاتی۔

فلم کی ہیروئن اذیت سے لذت حاصل کر رہی تھی۔ رسیوں' زنجیروں اور کوڑوں کا ایک عجیب و غریب طوفانی سا منظر بھی فلم میں

موجود تھا۔لزا جنگلی بلی کی طرح بے خوف وخطر اور آگے بڑھنے والی لڑکی تھی۔اس کے انداز میں طلب' جوش' بے تابی اور بے خودی کے ایسے ایسے رنگ دکھائے گئے کہ سعید حیرت زدہ رہ گئے۔اس نے تو کبھی خواب وخیال میں بھی نہیں سوچا تھا کہ مرد عورت کے ازلی تعلق کی ایسی ایسی ڈائمنشنز اور اشکال بھی ہوسکتی ہیں۔

بار شہلا! زندگی میں کوئی نہ کوئی نئی بات وقفے وقفے سے ہوتی رہنی چاہئے ورنہ تو بندہ بور ہو کر رہ جاتا ہے۔تم بھی ذرا گرم جوشی دکھایا کرونا.... کیا مٹی کا تودہ بن جاتی ہے!

اس نے دھیرے سے شکوہ کیا۔شہلا چپ ہوگئی۔سوچنے لگی واقعی یہ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔واقعی میں مٹی کا تودہ ہوں.... مجھ میں تو ایسی کوئی تڑپ یا لگن پیدا نہیں ہوتی جو آناً فاناً میرے جسم وجان کو پٹرول کی طرح آگ دکھادے۔مگر ایسا کیوں ہے! میں تو خود نہیں جانتی۔وہ جتنا سوچتی اتنا ہی الجھتی چلی جاتی۔

سعید کو شہلا سے بہت محبت تھی۔اس نے بڑی چاہت سے شہلا سے شادی کی تھی اپنی بچپن کی منگنی سو مشکلوں سے تڑوائی' کیونکہ ضدی آدمی تھا۔شہلا کی دھن جب سر پر سوار ہوئی تو اس نے کسی بات کی پرواہ نہیں کی اور اپنی من چاہی لڑکی کو حاصل کرکے ہی چھوڑا۔

مگر اب وہ سوچ رہا تھا' کیا میں نے واقعی شہلا کو حاصل کرلیا ہے؟ شاید کرلیا ہے مگر میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ اب شہلا بھی مجھے فتح کرے' مجھے حاصل کرے۔مجھے پانے کی خواہش کرے اور اس خواہش میں دیوانگی کی حدوں کو چھولے۔دیوانگی کی لذت کتنی ارفع ہوتی ہے' کاش میں بھی اس سے واقف ہوسکوں۔

کیا ہے ہمیں؟ کیا خرابی ہے ہمارے تعلق میں آخر؟ اچھے بھلے تو ہیں ہم؟ آپ کو تو نہ جانے کیا ہوگیا ہے! یہ سب ان فضول فلموں کا نتیجہ ہے اور کچھ نہیں! آپ کو تو نہ جانے کیا ہوگیا ہے! یہ سب ان فضول فلموں کا نتیجہ ہے اور کچھ نہیں! شہلا ایک دن اسی موضوع پر بات کرتے کرتے جھنجھلا گئی۔

آخر آپ کیوں اپنے آپ کو سکندر اعظم سمجھنے پر تلے ہوئے ہیں۔مجھے تو آپ کا ظالم وجابر ہونا کبھی بھی قبول نہیں ہوگا!

اس نے دوٹوک بات کی۔

شہلا Passive ضرور تھی مگر محبت سے عاری نہیں تھی۔پیار کے وقت اپنے شوہر کو پیار کرنے کا اس کا یہی طریقہ تھا کہ وہ اپنا دھان پان سا وجود اس کے چوڑے چکلے سینے کے بالوں میں یوں چھپالے جس طرح وہ ایک ننھا سا خوفزدہ ہرنی کا بچہ ہو۔

سعید فاتحانہ انداز میں تمغہ جیتنا شروع کر دیتا اور وہ اسے جیت لینے دیتی مگر ایسے میں وہ خود اپنے جسم کے خول کو وہیں چھوڑ اس میں سے پھسل کر اجنبی دنیاؤں کو پرواز کر جاتی اور وہ اس کا خالی جسم دھوبی کی طرح پٹختا رہ جاتا۔

صبح آتی تو وہ دوبارہ اپنی کینچلی میں خاموشی سے داخل ہو جاتی۔ بارش میں جنگل خوب خوش ہو کر نہاتا' نکھرتا' لیکن اس کا ایک حصہ ہمیشہ خشک رہ جاتا۔ پھونک مار کر بجھادی گئی موم بتی میں سے دھیرے دھیرے دھواں اٹھتا رہتا۔

اس کا جسم ایک ایسے بند کمرے کے فرنیچر کی مانند ہو گیا تھا جسے استعمال نہ کر سکنے کے باعث اس پر سفید چادریں ڈال دی جاتی ہیں۔ مگر ہوائیں ناامید نہ تھیں۔ وہ اس بند کمرے کے کواڑوں پر' بھی ہولے ہولے دستک دیتی رہتی تھیں کہ شاید کبھی دروازہ کھل جائے اور وہ اس میں داخل ہو جائیں۔ شہلا ایک بھرپور' نارمل زندگی گزار رہی تھی۔ مگر اس احساس سے وہ پیچھا نہیں چھڑا سکی تھی کہ اس کی زندگی کا کوئی خانہ خالی ضرور رہ گیا تھا۔ مگر وہ یہ بوجھ نہ سہہ سکتی تھی کہ وہ کیا تھا۔ اور وہ اس بارے میں کیا کرے۔

اسے پتہ تھا کہ سعید جسمانی سنجوگ کے وقت شہلا سے مطمئن نہیں ہوتا تھا مگر وہ اپنی طبیعت کے خلاف خود کو کوئی کام کرنے پر مجبور نہیں کر سکتی تھی۔ دیوانگی کی منزلوں تک پہنچنا اس کے لیے اتنا آسان نہ تھا جتنا سعید سمجھتا تھا۔ اس کے اندر ہر مشرقی لڑکی کی طرح مذہب' کلچر' ماحول' معاشرے نے رکاوٹوں کی میخیں گاڑ رکھی تھیں' روڈ بلاک کھڑے کر رکھے تھے جن سب کو وہ باہر نکال پھینکنے اور عبور کرنے سے قاصر تھی۔ ایک دوسرے سے بے انتہا محبت کرنے کے باوجود شہلا اور سعید جسمانی تعلقات کے ڈیپارٹمنٹ میں ایک دوسرے کے شناسا نہ تھے۔ راہ میں مل جاتے تو منہ ادھر ادھر کر کے اپنی اپنی راہ لیتے۔ نہ جانے مرد اور عورت کی چاہ اور چاہ کے اظہار کی تکمیل میں اتنا زیادہ فرق کیوں ہوتا ہے کہ وہ دونوں ساتھ ساتھ تو چل لیتے ہیں مگر متوازی لکیروں کی مانند کبھی مل نہیں پاتے۔ ایک کامن مرکز پر نہیں پہنچ پاتے۔ مرد جلد باز ہوتا ہے۔ مائکرو ویو اوون کی طرح منٹوں میں تپ جاتا ہے اور عورت مٹی کی کوری ہانڈی کی طرح دھیرے دھیرے پکتی رہتی ہے۔

سعید سمجھتا تھا کہ میدان اس لیے ہوتا ہے کہ اسے مار لیا جائے' وادی اس لیے ہوتی ہے کہ اسے پاٹ لیا جائے۔ مگر شہلا اس کی ہم خیال نہ تھی۔

وہ سمجھتی تھی کہ پھولوں بھری وادی میں جب قدم رکھیں تو رک رک کر اس کے سارے مزے لینے چاہئے۔ پھولوں کو چنیں' پھر سونگھیں' کالر میں لگائیں یا جوڑے میں اڑس لیں۔ آرام سے بیٹھ کر وادی کی بہتی آبشاروں کا نغمہ سنیں۔ ٹھنڈے پانی کے چھینٹے ایک دوسرے کی طرف اڑا دینے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہوتا۔

سعید کن فیکون' میں یقین رکھتا تھا اور شہلا وہ چڑیا تھی جو تنکا تنکا منہ میں لے کر آشیانہ بناتی ہے۔ وہ جوش جنوں میں طوفان بادو باراں بن جاتا اور شہلا' پیاسی دھرتی میں جذب ہونے کو بے قرار' قطرہ قطرہ گرتی ہوئی بارش۔

شہلا کالج کے زمانے سے ہی بہت تخیلاتی ذہن کی مالک لڑکی تھی۔ باربرا کارٹ لینڈ کے رومانی ناول اور گون وِد دا ونڈ' کی دیوانی یہ سمجھتی تھی کہ جب اصلی زندگی میں Rhett Butler کسی کو چھو لیتا ہے تو نہ جانے کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔

سعید کبھی Rhett Butler نہیں ہوتے۔ شہلا کو اب یہ بات سمجھ میں آ گئی تھی۔ اس لیے وہ زندگی کو ہنسی خوشی گذار رہی تھی اور اپنے میاں کی خوشی کے آگے ہمیشہ سر جھکا دیا کرتی تھی۔ جو وہ چاہتا' ہو جانے دیتی' لیکن اس کی اپنی شمولیت نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس کا اس سے زیادہ اب اس کے شوہر کو رنج رہتا تھا۔ حالانکہ ویسے ہر دوسرے معاملے میں وہ ایک اچھی بیوی ہونے کے ناطے اپنے شوہر کی جملہ ضروریات کا مکمل طور پر خیال رکھتی تھی۔

کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں؟ ایک رات سعید نے بے خبر سوئے ہوئے مٹی کے تودے کو زور زور سے ہلایا۔

کیا ہے؟ کیا ہوا؟ شہلا ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

مجھے نیند نہیں آ رہی! میں سوچ رہا ہوں شاید میں تمہیں اچھا نہیں لگتا ورنہ تم یوں کھٹ سے نہ سو جایا کرتیں۔ میرا مطلب ہے کوئی بات نہ چیت! نہ میاں بیوی والا راز و نیاز! یہ کیا طریقہ ہے؟

سعید شاید غصے میں تھا یا مایوس۔ شہلا کو کچھ سمجھ نہیں آئی۔

لگتے کیوں نہیں! بڑے اچھے لگتے ہیں! شہلا شرارتی انداز میں مسکرائی اور اس کے سینے میں گھسنے کی کوشش کرنے لگی۔

ہنو بھی تمہیں تو بس یہی آتا ہے۔ چپک کر رہ گئیں! بس اور کچھ نہیں! سعید کچھ بور سا ہو چکا تھا' مگر شہلا کا لمس محسوس کرتے ہی اسے سکون سا ملنے لگا۔ حسب سابق' پل بھر میں اس پر جنون طاری ہو گیا۔ وہ بڑا زبردست مرد تھا' تہس نہس کر دینا' روند ڈالنا اس کے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ شہلا کٹی پتنگ کی طرح ہچکولے کھانے لگی۔

سعید یہ نہیں جانتا تھا کہ اس طرح اس کی بیوی کی اندر کی کنواری روح مزید یخ بستہ اور بے جان ہو جاتی ہے۔ اس کا تمازت پیدا کرنے کا یہ طریقہ بالکل بے کار ثابت ہوتا بلکہ خواہش کا اگر کوئی ننھا سا دیپ سر ابھارنے کی کوشش بھی کرتا تو اتنی سختی اور درشتی دیکھ کر آپ ہی آپ بجھ جاتا۔

آج سعید کا جنون ایک نئی سی صورت اختیار کر چکا تھا۔ وہ حیران تھی' مگر اس نے کوئی مدافعت یا مزاحمت نہیں کی۔ بے سدھ

پڑی رہی۔ اپنا فرض نبھاتی رہی۔

سعید کو پہلی بار اس پر' اس لیئے' غصہ آنے لگا۔ وہ اتنی ٹھنڈی کیوں تھی؟ آخر وہ کیا چاہتی تھی یا کچھ چاہتی کیوں نہیں تھی؟

''شادی کی پہلی رات سے لے کر اب تک تم ویسی کی ویسی ہو۔ تمہارے رویئے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ تمہیں پتہ ہے۔ Variety is the spice of life پھر ایسا کیوں ہے ہمارے درمیان؟

شہلا کے دل پر گھونسہ سا لگا۔ شادی کی پہلی رات کا تذکرہ کر کے سعید نے کچھ اچھا نہیں کیا تھا۔ اس رات جس جس طرح شیشے کے محل کی دیواریں ٹوٹی تھیں' ان کی کرچیں آج بھی شہلا کو اپنے دل میں چبھتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔

مرد اور عورت کے سہاگ رات کے Concept میں بھی زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ مرد جسم کے تسخیر کر کے خود کو بڑا سورما سمجھنے لگ جاتا ہے اور عورت کوئی ہے جو اس روح کی تسخیر کرے۔ کی صدا لگاتی' ہاتھ میں خالی کشکول تھامے' کھڑی رہ جاتی ہے۔

عورت کے لیے سہاگ رات کی حیثیت تصوراتی ہوتی ہے۔ جبکہ مرد کے لیے واقعاتی۔ مرد اسے ایک محض جسمانی لطف اٹھانے کے لیے؟ آسودگی بخش رات' سمجھتا ہے جس میں وہ ایسے ایسے معرکے مار لیتا ہے جن کے بارے میں اس نے بڑے بڑے منصوبوں کے پل باندھ رکھے ہوتے ہیں۔

عورت سہاگ رات سے زیادہ سہاگ رات کے تصور سے پیار کرتی ہے۔ جوانی کی اولین دہلیز پر قدم رکھتے ہی اس حسین تصور کی جی جان سے پرورش کرتی ہے۔ اسے سنبھال رکھتی ہے' سینچتی ہے' سجاتی رہتی ہے۔ اگر سہاگ رات اس کے تصور کے عین مطابق نہ ہو تو وہ جسم کی شکست وریخت کا غم نہیں کھاتی مگر اپنے حسین خواب' اپنے محبوب تصور کے ملیامیٹ ہو جانے کا عمر بھر ماتم کرتی رہتی ہے۔ پاؤں میں کھڑاویں پہن' سوگ کا سیاہ چولا گلے میں ڈال چپ چاپ زندگی کے سفر پر اسی طرح روانہ ہو جاتی ہے جس طرح اس سے توقع کی جاتی ہے۔ مگر وہ اپنے آپ کو پس پشت ڈال دیتی ہے۔

مرد کی جنسیت اس کے اعضاء کی طرح ظاہری ہوتی ہے اور وہ جسمانی کشش کا جواب بھی ظاہری طور پردے کر دو ہی منٹ بعد خراٹے لینے لگ جاتا ہے جبکہ عورت کی مخفی ہوتی ہے۔ پر اسرار اور سوچنے پر مجبور کر دینے والی۔ وہ اپنی چاہت کا جواب بھی دل کے نہاں خانوں سے ہی دیتی ہے۔ اور اپنے جذبات کو محبت کے غلاف میں لپیٹ کر دل سے ریلیز کرتی ہے۔ جسم سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا' جسم وہ مرد کو خوش رکھنے کے لیے ایک طرف الگ رکھ چھوڑتی ہے۔

جسمانی تعلق اس کے نزدیک جذباتی قربت کے حصول کا ایک وسیلہ ہے۔ اس قربت کے ذریعے وہ ذہنی' جسمانی' دلی' روحانی'

ہر لحاظ سے مرد کے ساتھ مل کر ایک عدد بن جانے کی خواہش کرتی ہے۔ وہ سمجھتی ہے اس کے بعد ہی اس کی شخصیت کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ اور باقی کچھ نہیں رہتا۔ کوئی کمی نہیں رہ جاتی۔ جسمانی اتصال کو وہ روحانی اتصال کا ایک وسیلہ ایک ذریعہ ایک دوسرے کی ذات تک پہنچنے کا پل سمجھتی ہے اسی لیے جیسے تیسے اس قبول کر لیتی ہے۔

مرد فطرتاً ازل سے شکاری ہے۔

بازار سے جوتا خریدنے جاتا ہے تو عموماً پہلی ہی دکان سے ایک عدد جوتا شکار کر لیتا ہے۔ عورت بازار سے قمیض کا کپڑا خریدنے جاتی ہے تو جگہ جگہ رکتی ہے۔ سوچتی ہے دیکھتی ہے پرکھتی ہے پھر چھوڑ دیتی ہے۔ کبھی اگلی دکان پر جاتی ہے کبھی پچھلی دکان پر دوبارہ لوٹ جاتی ہے۔ اس سارے کام پر وہ وقت لگاتی ہے اور اس پر اپنی بھرپور توجہ دیتی ہے محنت کرتی ہے۔ جب اس کی حسب منشاء کپڑا مل جاتا ہے تو اس کا شکار نہیں بلکہ چناؤ کرتی ہے۔ اسے فرض نہیں بلکہ "لیبر آف لو" تصور کرتی ہے۔

شہلا بھی اسی قسم کی عورتوں میں سے ایک عورت تھی جو خوابوں کے جزیرے میں بسیرا کیے رہتی ہیں گھنے جنگلوں میں کچے سیبوں کے شگوفے تلاش کرتے نہیں تھکتیں۔ سہاگ رات کو ان کے ماتھے پر ارمانوں کے ٹیکے جھومر اور بدن پر خواہشات کے دمکتے زیور سجے ہوئے ہیں۔ حسرتوں اور انجانے ان دیکھے لمحوں کا دلکش خوف چہرے پر گلال بن کر دمکتا ہے تو ان کو زندگی بہت حسین لگتی ہے۔ شہلا کو بھی یہی یقین تھا کہ اس کے خاوند کے ساتھ اس کی یہ ملن رات ایک "آوٹ آف دس ورلڈ" تجربہ ثابت ہوگی۔ چاند ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے پاؤں میں اپنی افشاں بچھائیں گے۔ قوس قزح چھم سے کمرے میں اتر آئے گی اور دھرتی سانس لینا بھول جائے گی۔ اس رات محض جسموں کا ملاپ نہیں بلکہ روحوں کا ملاپ ہوگا۔ اس عظیم ملاپ کے لیے رات چھوٹی پڑ جائے گی اور وہ دل ہی دل میں یہ مصرعہ یاد کر کے مسکرائے گی۔

گل مکی نہ سجن نال میری تے ربا تیری رات مک گئی۔

اس کا خیال تھا یہ رات دونوں کی شخصیتوں کی خوبصورتی کا بغور مطالعہ کرنے کی رات ہوتی ہے۔ جسم تو ایک خول بنا رہ جائے گا جس میں سے اندر کی رعنائیاں باہر کو منعکس ہوتی ہیں پھر اس کی ست رنگی روشنیاں ایسی پچکاریاں چھوڑتی ہیں کہ دوسرا باؤلا ہی تو ہو جاتا ہے۔

سہاگ رات منانے کا اس کا ایک اپنا ہی ذاتی پروگرام تھا۔ اس نے چھوٹی چھوٹی تفصیلات بھی ذہن میں خود ہی طے کر رکھی تھیں۔ اور اسے یقین کامل تھا کہ ایسا ہی ہوگا جیسا کہ وہ سوچ رہی تھی۔

وہ دل ہی دل میں ٹھان چکی تھی کہ وہ اپنے من چاہے محبوب کی اپنی پوری ہستی سے پذیرائی کرے گی۔ اس طرح سے اپنی محبت اور توجہ کے خزانے لٹائے گی کہ وہ اپنی قسمت پر ناز کرے گا۔

پہلے ہم ننگی گھاس پر ٹہل کر چاندنی رات کا نظارہ کریں گے۔ وہ میرا ہاتھ تھام کر میری گود میں سر دیئے لیٹیں گے اور اس خوشی کے احساس سے بار بار مجھے اپنے ساتھ لپٹائیں گے۔ میری زلفوں کے بل کھولتے کھولتے انہیں کالی گھٹاؤں سے تشبیہ دیں گے تو میں شرارت سے انہیں منہ چڑا کر کسی اندھیری جھاڑی کے پیچھے جا چھپوں گی۔

چاندی کی پازیبیں پہنے وہ سفید رنگ کا گھوڑا ابھی تو پاس ہی کہیں ہنہنا کر اپنی پازیبیں چھنکار رہا ہوگا جس پر وہ ابھی بادلوں میں سے اتر کر آئے ہوں گے۔

وہ مجھے اس پیار اور احتیاط سے پھولوں کی سیج پر لٹائیں گے جس طرح میں بھی ایک پھول ہوں۔ دھیرے دھیرے میرا زیور ایک ایک کر کے اتاریں گے تو سرگوشی کر کے کہیں گے۔ بھئی یہ جھمکے تمہارے حسن اور ہمارے عشق کے راستے میں حائل ہیں اس لیے ہم ان سے جل رہے ہیں۔ بھنورے کی طرح تحمل سے قطرہ قطرہ رس اپنے اندر انڈیلیں گے، بے صبری سے پورے جگ کو منہ لگا کر غٹا گٹ نہیں پی جائیں گے۔ آخر ہر بات میں سلیقہ تو ہونا ضروری ہوتا ہے نا۔

میرے جسم کے ایک خلیہ سے دوسرے خلیہ تک کا سفر طے کرتے ہوئے ان گنت صدیاں بیت جائیں گی اور ان خلیوں میں خواہشوں کے دیپ آپ ہی آپ جلتے چلے جائیں گے۔ ایسی جھلملاہٹ ہوگی، روشنی پھیلے گی کہ میری آنکھیں خیرہ ہو کر رہ جائیں گی۔ میں محبت کے سمندر میں اس طرح ڈوبتی چلی جاؤں گی کہ ہمیشہ کے لیے گم ہو جانے کو جی چاہنے لگے گا۔

ان طلسماتی لمحوں میں نہ جانے کیا سے کیا ہو جائے گا۔ کیا سے کیا ہو جاتا ہے اس ''بگ بینگ'' سے پہلے جس کے بعد کائناتیں معرض وجود میں آتی ہیں۔ مجھ میں جو مقناطیسیت ہے، اس کے باعث وہ ایک بے حس کمزور بچے کی مانند میرے قدموں میں بیٹھ کر مجھ سے محبت کی بھیک مانگیں گے۔ شہلا اپنی تصورات میں گم سیج پر بیٹھی تھی کہ یکدم دروازہ زور سے بند ہونے کی آواز کانوں میں آئی اور اس کے خیالات کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

اٹینشن کمانڈر آف می! میجر سعید نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کھٹ سے فوجی انداز میں سیلوٹ مارا، اور بستر پر پھسکڑا مار کر بیٹھے ہوئے دلہن کا گھونگھٹ اتار دور پھینکا۔

اوہ مائی گاڈ! یار یہ کس نے حرکت کی ہے؟ میری اتنی پیاری سی گڑیا کو کارٹون بنا کر رکھ دیا۔

وہ ہنسنے لگا۔ شہلا کھسیانی سی ہو کر سکڑنے لگی۔

اور یہ زیور! یار بالکل مال بردار گاڑی لگ رہی ہو! کیا تمہیں گھبراہٹ نہیں ہو رہی اتنا کچھ پہننے سے؟ چلو چلو شاباش میری جان! اٹھو باتھ روم جا کر کپڑے وپڑے بدلو۔ Get comfortable اور کچھ نارمل لگو۔ اور ہاں یہ سارا میک اپ شیک اپ اتار کر میرے پاس اپنی اصلی شکل لے کر آنا! بہت تھک گئے بھئی آج تو اور جلدی آنا! انتظار نہ کرانا میری جان! وہ بستر پر جوتوں سمیت لیٹ گیا۔

شہلا اپنا بھاری عروسہ جوڑا اور زمین پر گرا دوپٹہ سنبھالتی' ہولے ہولے اٹھی اور باتھ روم کی طرف چل دی۔

جب وہ کچھ دیر بعد منہ ہاتھ دھو کر سادہ نائٹ سوٹ میں کمرے میں جھجکتی جھجکتی داخل ہوئی تو اسے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ Rhett Butler کب کا بے خبر سویا' خراٹے لے رہا تھا۔

اسے سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کرے۔ اسے جگائے' یا سونے دے۔ جگائے تو اس کی اپنی انا زخمی ہوتی تھی۔

اگر اسے سونے دے تو پھر سہاگ رات... اور اگر وہ پوری رات ہی نہ اٹھا تو... یہ تو بڑی خاص رات تھی... وہ بستر پر بیٹھ کر ایک پاس پڑا رسالہ پڑھنے کی کوشش کرنے لگی مگر الفاظ' آنکھوں میں خوامخواہ پانی آ جانے کی وجہ سے گدلے گدلے نظر آنے لگے۔ اس لیے اس نے رسالہ اٹھا کر رکھ دیا اور پرے منہ کر کے باقاعدہ پروگرام بنا کر آنسو بہانے لگی۔

بادلوں میں سے' سفید گھوڑے پر بیٹھا شہزادہ نظر تو آ رہا تھا مگر اس کا نیچے اترنا کافی مشکل دکھائی دے رہا تھا۔ پازیبوں کی مدھم ہوتی چھنک بتا رہی تھی کہ وہ دور ہوتا جا رہا ہے۔ نہ جانے کیوں؟ مگر ہمیشہ سے ہی' شہزادوں اور نیچے کھڑی منتظر داسیوں کے بیچ زمانوں سے' کچھ نہ کچھ ہمیشہ حائل ہوتا رہتا ہے۔

شہلا آنکھیں موند کر سونے کی کوشش کرنے لگی کیونکہ اس کی خودداری آنسو تو بہا سکتی تھی مگر سوئے ہوئے شوہر کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے نیند سے نہ جگا سکتی تھی۔ ابھی اس کی آنکھ لگی ہی تھی کہ یکا یک زلزلہ سا آ گیا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کا جسم کوئی فوکر جہاز تھا جو گھنے امیزون کے جنگلوں میں نیچی پرواز کرتے کرتے دھڑام سے کریش ہو گیا ہو۔

ایک طوفان سا کمرے میں گھس آیا اور اسے ملیا میٹ کر کے رکھ دیا۔ وہ سوچتی ہی رہ گئی کہ یہ ہوا کیا ہے کہ یکدم طوفان تھم گیا اور مطلع صاف ہونے لگا۔ مگر اب تک تو وہ اپنے ریلے میں سب کچھ بہا کر لے جا چکا تھا۔ گرم توے پر پانی کا قطرہ پل بھر کو ناچا' پھر بلبلہ بن کر ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ امیزون کے گھنے جنگل میں جہاز کے ٹکڑے پھٹی پرانی دھجیوں کی طرح درختوں سے جا چپک رہے

تھے۔ دھماکہ اتنی زور سے ہوا تھا کہ دور دور تک جنگل کے چرند پرند چیں چیں کرتے' شور مچاتے' سرپٹ بھاگ رہے تھے

نئی نویلی دلہن اپنی پوری ہستی' اپنی کائنات جتنی وسیع محبت' اپنی مکمل سپردگی کے تحفے کا گفٹ باکس ہاتھ میں تھامے منتظر کھڑی رہ گئی۔ نہ اس کا سنہری فیتہ کھلا' نہ رنگین کاغذ احتیاط سے اتارا گیا' کیونکہ فیتے اور کاغذ کے چکروں میں پڑ کر تحفے تک پہنچنے کا کٹھن انتظار کون کرتا۔

اسے پتہ چل گیا کہ اس سنسان سڑک پر وہ اب اکیلی' تن تنہا ہی چلتی جائے گی۔ اس اس کا ساتھی ساتھ لے کر نہ چلے گا۔

وہ بہادر اور سمجھدار لڑکی تھی۔ اس بات پر فساد کھڑا کر کے اپنی ہر طرح سے خوشگوار زندگی کو ناہموار راہوں پر دھکیلنا اسے پسند نہ تھا اس لیے اس نے اپنی سپردگی کے تحفے کو ہمیشہ کے لیے مقفل کر کے چابی سمیت گہرے پانیوں میں پھینک دیا۔

اب زندگی ٹھیک ٹھاک ہی گزر رہی تھی۔ اس نے اپنے شوہر کے طور طریقوں سے سمجھوتہ کر لیا تھا مگر اب سعید کو یہ نئے سرے سے جوشوق چرایا تھا کہ اس کی بیوی بھی انگلش فلموں کی ہیروئنوں کی طرح دیوانگی کا اظہار کرے' اس کی اسے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی۔

ایک رات پھر وی سی آر پر اسی قسم کی فلم دیکھنے کے بعد شہلا کو مصیبت پڑ گئی۔ وہ حسب معمولی وی سی آر لگتے ہی نیند کی وادی میں پہنچ چکی تھی اور سعید اس کی بے نیازی پر پیچ وتاب کھا رہا تھا کہ نہ جانے سعید کو کیا ہوا کہ اسے پھر جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ اس کا دل نہ جانے کیا چاہ رہا تھا۔

ہاں جی! کیا بات ہے سونے دیں نا۔ وہ خواب آلود آواز میں بولی سعید کو زمین پر کنڈلی مارے دوپٹے کو دیکھ کر دل لگی سوجھنے لگی اور اس نے سوئی ہوئی شہلا کے دونوں ہاتھ باندھنے شروع کر دیے۔

ارے ارے! یہ کیا کر رہے ہیں آپ! اس نے جاگ کر شور مچانا شروع کر دیا۔

بور نہ کرو خاموش پڑی رہو! سعید نے ہولے سے ڈانٹا۔

کھولیں میرے ہاتھ' مجھے نہیں اچھی لگتیں ایسی باتیں۔

تمہیں اچھا لگتا ہی کیا ہے۔ سب کچھ نا مگر یہی اچھا نہیں لگتا۔

سعد کا موڈ خراب ہونے لگا۔

فلمیں دیکھ دیکھ کر جناب کا دماغ خراب ہو گیا ہے! شہلا کا بھی پارہ چڑھ گیا۔ سعید کو اس کی جھنجھلاہٹ پر ہنسی آنے لگی مگر اس نے اپنی ہنسی کو قابو میں رکھ کر یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ وہ مکمل طور سنجیدگی اختیار کیے ہوئے ہے۔

کمرے میں موجود ایک تپائی پر کچھ پھل اور چھری رکھی تھی۔ سعید کے ذہن میں نہ جانے کیا آئی کہ چھری ہاتھ میں پکڑ لی اور زور زور سے خونخوار آوازیں نکالنے لگا۔ آخر انگلش فلموں میں تو یہی دکھاتے ہیں کہ ہیروئن کو جتنی اذیت دو اتنا ہی اسے اچھا لگتا ہے۔

اس نے تو صرف چھری کو ادھر ادھر لہرانا ہی شروع کیا تھا کہ شہلا نے ہسٹریائی انداز میں چیخنا شروع کیا تھا کہ شہلا نے ہسٹریائی انداز میں چیخنا شروع کر دیا۔ اس پر عجیب و غریب قسم کی دہشت طاری ہو گئی اور خوف سے اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔

سعید کو اسے چھیڑنے میں اور مزا آنے لگا اور اس نے اپنے لبوں پر یوں زبان پھیرنی شروع کی جس طرح وہ کوئی فلمی غنڈہ ہو اور ہیروئن کو اکیلی پا کر نگل جانا چاہتا ہو۔ اب اس نے چھری کی نوک کو شہلا کے نرم و نازک جسم سے دھیرے دھیرے چھونا شروع کر دیا۔

ابھی تو ہم آپ کو زنجیروں سے باندھ کر کوڑے ماریں گے... ہاہاہا۔ جب آپ Damsel in distress کی طرح ہمارے رحم و کرم پر پڑی بے بسی سے ہماری طرف دیکھ کر التجا کریں گی تو ہم حاکم وقت آپ پر ترس کھانے کی بجائے آپ سے پیار کریں گے... ہاہاہا" وہ سکندر اعظم بننے پر تلا ہوا تھا مگر شہلا کو تو بس ایک ہی خیال سر پر سوار تھا کہ اس کا میاں پاگل ہو گیا ہے۔ اور اس سے جتنی جلدی ہو سکے اسے دور بھاگ جانا چاہیے۔ اس نے ایک زخمی شیرنی کی سی پھرتی کے ساتھ ایک زقند لگائی اور سعید کو زور سے دھکیل کر کمرے سے باہر نکال دیا۔ چوہیا میں نہ جانے اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی کہ وہ بالوں بھرے تو انا ریچھ سے جا ٹکرائی تھی۔ ٹھنڈی چھری کی سینہ چاک کر دینے والی دھات کا تصور کرتے ہی اسے ایک جھرجھری سی آ گئی۔

اس نے جلدی سے دروازے پر چٹخنی چڑھا دی اور پسینے میں شرابور یوں ہانپنے لگی جیسے میلوں بھاگتی چلی آئی ہو۔ سعید باہر سے دروازے پیٹنے لگا مگر شہلا نے بھی گویا دروازہ نہ کھولنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ بھئی میں تو مذاق کر رہا تھا جانو! یہ کیا تماشا ہے؟ دروازہ کھولو نا ... یار ایسے ہی مستی سوجھ رہی تھی۔ کم آن بی اے فرینڈ!... تمہاری سپورٹس مین سپرٹ کہاں چلی گئی یار؟

شہلا کے کان پر اس واویلے کو سننے کے بعد بھی جوں تک نہ رینگی۔ سعید نے ان کے اتنے پاک 'اتنے مقدس' اتصال کے لمحے کو چھری جیسی واہیات چیز سے آلودہ کر دیا تھا' اس کے اندر اتنا خوف بھر دیا تھا کہ وہ بری طرح نروس ہو گئی تھی۔ وہ بے اختیار آنسو بہانے لگی۔

سعید نے منت سماجت فیل ہوتے دیکھ کر دروازے پر ایک زوردار لات رسید کی اور ٹی وی لاؤنج پر ہی رات بسر کرنے کے ارادے سے صوفے پر دراز ہو گیا۔

آدھ پون گھنٹے بعد شہلا نے چپکے سے دروازہ کھول کر جھری میں سے جھانکا وہ کسی معصوم بچے کی طرح بے خبر پڑا سو رہا تھا۔
شہلا نے معصوم بچے پر کمبل ڈالا اور خود کچھ دیر کے لیے لان میں چہل قدمی کرنے کے لیے نکل گئی۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ دماغ پر ہتھوڑے سے برس رہے تھے۔ حلق میں پھانسیں چبھنے لگیں اور سارے جسم میں ایک بے چین کر دینے والے تناؤ نے دردیں شروع کر دیں۔

دن ہوا تو شہلا کا خوف کچھ کم ہوا اور اس نے معمول کے مطابق گھر کے کام کاج کرنے شروع کر دیئے۔ مگر جونہی رات آئی' اس نے اپنے کمرے کی پھر چٹخنی لگا لی۔ سعید بڑبڑاتا رہ گیا' مگر شہلا نے اس کو ساتھ سلانے سے صاف انکار کر دیا۔ اسے سعید کی وحشت' دیوانہ پن اور چھریوں' کوڑوں کا ذکر یاد آ جاتا اور وہ خوفزدہ ہو جاتی۔

سعید رات کو اکیلا پڑا وی سی آر پر فلمیں دیکھتا اور پھر اکیلا ہی صوفے پر دراز ہو جاتا۔ جب سے ان کی شادی ہوئی تھی وہ اور شہلا کبھی علیحدہ نہیں سوئے تھے اس لیے اسے بہت عجیب عجیب سا لگ رہا تھا۔ وہ رات بھر کروٹیں لیتا رہتا اور اپنی بیوی کی جہالت اور کوڑھ مغز ہونے کا ماتم کرتا رہتا۔ تمہیں تو پتہ ہی نہیں دنیا کہاں سے کہاں پہنچ چکی ہے! تم وہی دقیانوسی خیالات کو لے کر بیٹھی ہو۔ وہ دروازے کے باہر ایک اور لات رسید کر دیتا۔

شہلا کو بھی سعید کے سینے سے چپک کر سونے کی اتنی عادت پڑ گئی تھی کہ وہ بھی ساری رات اس شہزادی کی طرح کروٹیں لیتی رہتی جس کے بستر کی لاتعداد تہوں کی نیچے مٹر کا دانہ رکھ دیا گیا تھا۔

ایک رات شہزادی مٹر کے دانے کے آگے ہار گئی اور بستر سے اٹھ بیٹھی۔ نیند نہیں آ رہی تھی۔ سوچا کچھ کام ہی لینا چاہیے۔ خوامخواہ بستر پر لوٹ کر کیا وقت ضائع کرنا۔ ادھر ادھر دیکھا۔ کمرہ ٹھیک ٹھاک تھا' ہر چیز ٹھکانے پر رکھی تھی' مگر کپڑوں کی الماری اپنا درد بھرا افسانہ سنا رہی تھی۔

شہلا کی عادت تھی کہ وہ کپڑوں کو اندھا دھند ٹھونس دیا کرتی تھی پھر وقت پڑنے پر سارے ڈھیرے کو باہر نکال دیتی' مطلوبہ شے ڈھونڈ کر ڈھیر کا ڈھیر اسی خوبصورت بدنظمی سے دوبارہ کو اندر دھکیل دیتی۔

اس نے اپنی الماری کے آگے کھڑے ہو کر ایک عظیم الشان فیصلہ کیا کیوں نہ اپنے کپڑوں کی تہیں لگا کر سیٹ بنا کر ہی رکھ لوں آج! اس طرح وقت بھی کٹ جائے گا اور کام بھی ہو جائے گا۔ ورنہ دن میں تو اتنے وقت کا ملنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس نے اس ارادے سے جیسے ہی الماری کھولی کپڑے ابل ابل کر باہر کو چھلکنے لگے۔

وہ آرام سے زمین پر چوکڑی مار کر بیٹھ گئی اور اپنے جوڑے سیٹ کرنے لگی۔ کسی کی شلوار کسی کے ساتھ لگی تھی اور کسی کا دوپٹہ کسی کے ساتھ۔ اس نے بیٹھ کر بڑے تحمل سے ان سب کو اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔

اس کی کالی کڑھائی والی ملتانی قمیض' پر لگے چاندی کے بٹن اپنے اپنے کاجوں میں سے باہر نکل رہے تھے۔ شہلا نے ایک ایک کو آرام سے اپنی جگہ پر لٹکایا مگر نہ جانے کڑھائی کا کونسا فالتو دھاگا ایسے لٹک رہا تھا کہ وہ شہلا کے انگشت شہادت کے لانبے ناخن میں اٹک کر رہ گیا۔ جیسے ہی دھاگہ اس کے ناخن میں پھنسا' ناخن میں ایک روزدار کریک آ گیا۔ شہلا کے منہ سے زور سے چیخ نکل گئی۔ دھاگہ کریک میں پھنسا ہوا تھا اور دھاگے کے زور پر پوری ملتانی کڑھائی والی قمیض لٹک رہی تھی۔

یکلدم بند دروازے پر ہولے سے دستک ہوئی۔

کیا ہوا شہلا؟ تم نے چیخ کیوں ماری ہے؟ خیر تو ہے؟

سعید بھی شاید ابھی تک سو نہ سکا تھا۔ شہلا کی چیخ سنتے ہی دروازے پر آن کھڑا ہوا۔

بغیر سوچے سمجھے شہلا نے دروازے کے پٹ کھول دیئے۔ اس وقت وہ سب کچھ بھول چکی تھی صرف یاد تھا تو یہ کہ ناخن آدھا ٹوٹا آدھا ساتھ لگا ہوا ہے اور درد سے جان نکلی جا رہی ہے۔

ارے یہ کیا ہوا؟ سعید نے خمار آلود آنکھوں سے ناخن میں لٹکی قمیض دیکھ کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔

ناخن ٹوٹ گیا ہے! نظر نہیں آ رہا.... اتنا درد ہو رہا ہے' ہائے میں مر گئی!

اچھا! ادھر لاؤ دکھاؤ... اپنا ہاتھ! شہلا نے کسی فرمانبردار بچے کی طرح اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔

نیل کٹر کہاں ہے؟ لاؤ میں اسے کاٹتا ہوں! سعید نے ناخن کی سچویشن کا بغور معائنہ کر کے کہا۔

وہ ادھر دراز ے میں ہے! شہلا نے نیل کٹر کی نشاندہی کی۔ سعید نے نیل کٹر سے ریتی علیحدہ کر کے بڑی دھیان' اطمینان اور احتیاط سے پہلے وہ دھاگہ کاٹا جس کے زور پر قمیض اٹکی ہوئی تھی۔

پھر بڑے پیار سے اس کی نرم و نازک انگلی تھام کر ناخن کو گوشت کے قریب قریب کاٹا تاکہ اسے کم سے کم تکلیف پہنچے۔ حالانکہ اس دوران شہلا نے مستقلاً اف' ہائے' اوئی کی گردان جاری رکھی ہوئی تھی۔

الٹی سیدھی حرکتیں کرنے میں تو تمہارا جواب ہے ہی نہ بالکل... اور سمجھتی ہیں کہ بہت عقلمند ہیں محترمہ....

وہ پیار بھرے انداز میں سرزنش کرنے لگا اور وہ چپکی بیٹھی سنتی رہی۔ سمجھتی ہیں کہ ہم بڑے ظالم ہیں' خونخوار درندے ہیں جی

... انسانیت سے دور کسی وحشی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ تو پھر ہم سے آپ کو اس وقت ڈر کیوں نہیں لگ رہا۔ اب کیوں بھیگی بلی بنی بیٹھی ہیں۔

شہلا۔ کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔

اچھا جی ہم تو چلے.... ہمارا کام ہو گیا۔ بیگم صاحبہ اجرت دیں یا نہ دیں' اب ہم زبردستی نہیں کریں گے۔ او کے سویٹ ہارٹ گڈ نائٹ!

اس نے شہلا کے گال پر شفقت بھرا بوسہ دیا اور اسے تھپتھپا کر باہر ٹی وی لاؤنج میں جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ شہلا اپنی انگلی تھامے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ یہ سعید تھا اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس کا تو خیال تھا آج دروازہ کھل گیا تو وہ بستر میں ہی آ کر سوئے گا بھلا اس سے اچھا موقعہ اسے کہاں ہاتھ آئے گا دوبارہ اندر گھس آنے کا' مگر سعید تو اسے حیران کر رہا تھا۔

اس نے نہ زبردستی کی' نہ ضد نہ ہاتھا پائی' آرام سے ہتھیار پھینک دیئے۔

میں اس کی دسترس میں ہوں تو
مگر وہ مجھ کو میری رضا سے مانگتا ہے

شہلا کو اپنا ایک پسندیدہ شعر یاد آنے لگا۔ مگر سعید کے بجائے اب اس میں دیوانگی کا سمندر موجیں مارنے لگا تھا۔ سعید کی نرمی نے' اس کے نیل کٹر کی کاٹ میں چھپی Tenderness نے سوئی ہوئی عورت میں بیدار ہو کر ہلچل سی مچا دی۔

سعید نے اسے یوں تو کبھی یعنی چھوئے بغیر نہ چھوڑا تھا۔ برف پگھلی تو دریاؤں میں طغیانی سی آنے لگی۔

وہ بلا سوچے سمجھے' ایک روبوٹ کی طرح چلتی' سعید کے سرہانے جا کھڑی ہوتی۔

''جی؟ فرمایئے؟'' وہ اپنی مسکراہٹ چھپاتا ہوا بولا۔

اور کوئی خدمت درکار ہو تو غلام حاضر ہے'' وہ مزید چھیڑے چلا گیا۔

شہلا اس کے سینے سے لگ کر بھیں بھیں کرنے لگی۔ اسے خود نہیں سمجھ میں آ رہا تھا کہ یہ آنسو کس قسم کے تھے۔ کس بات کے تھے۔ شاید ہر بات کے تھے۔ ان میں خفت' جھنجھلاہٹ' بے بسی' کھسیانہ پن' ناکامی' خوشی' طلب' تقریباً ہر رنگ کے بے رنگ پانی شامل تھا۔ شہلا اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر بیڈ روم کی طرف کھینچنے لگی اور سعید کھنچتا چلا گیا۔

سعید نے اس کی زخمی انگلی کی نازک سی پور کو اپنی گھنی مونچھوں سے چھوا تو شہلا کے جسم میں ایک زلزلہ سا آنے لگا۔

اندھیرے کمرے میں لاتعداد روشنیوں کے حامل بلب آٹومیٹک بٹن دب جانے کی وجہ سے جل اٹھے۔ انگلی کی پور سے لے کر جسم کے ہر حصے میں حسیات کے الیکٹروڈز کے ننھے ننھے پاور سٹیشن جی اٹھے۔ ایک برقی رو نے ان کنکشنز کے ذریعے ایسے ایسے راستوں پر سفر کرنا شروع کر دیا۔ جن پر انہوں نے پہلے کبھی سفر نہیں کیا تھا۔ شہلا کے بدن سے شہد ٹپکنے لگا اور سانس کی مہک بدل گئی۔ آنکھوں کا سرمہ جادو بن کر قیامت ڈھانے لگا۔

سعید خوش ہو گیا۔ ایسا نظارہ تو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ سیلاب میں دریا کو دوسری طرف سے چڑھتے دیکھ کر کون ہے جو حیران نہ ہوا ہو ایسا جل تھل تو اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ وہ شرابور ہو گیا۔

کمرے میں نیلے' گلابی غباروں کے گچھے اترتے چلے جا رہے تھے اور انہوں نے رنگ و بو کا ایک ہنگامہ برپا کر دیا تھا۔

بھئی آج لزا وی سی آر میں سے نکل کر ہمارے ہاں کیسے چلی آئی؟ سعید نے شہلا کی ننھی سی ناک کو پیار سے چھوا۔

اب کی بار جب بارش آئی تو سارے کا سارا جنگل اس میں ناچا اور نہایا۔ صبح کی اولین' شرمیلی دستک سے پہلے ہی پات پات پھول پھول نکھر چکا تھا۔

رات بھر کی ٹھہری ہوئی' جمی ہوئی' سبزی مائل سیاہ کائی تلے اگنے والا کنول کا بے داغ پھول بھی چہرہ باہر نکال کر تازہ ہوا سے اٹھکیلیاں کرنے لگا۔



تھوڑی کھلی تھوڑی بند آنکھیں

مظہر نے پل بھر کو رک کر پورے ماحول پر ایک بھرپور نظر ڈالی۔ سب کچھ ٹھیک بلکہ پرفیکٹ تھا۔ اس کا آئیڈیل گھر اب اس کی اپنی ملکیت تھا۔ جس کا سب سے پرکشش حصہ اس کا بڑا سا سوئمنگ پول ایک خوبصورت نیلے ہیرے کی طرح جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا۔

اس روز آسمان بھی حیرت انگیز طور پر بدلیوں سے بالکل پاک اور کھرا تھا۔ نیلے بے داغ سوئمنگ پول میں نیلے نیلے آسمان کا عکس اتنا واضح تھا کہ یوں لگتا تھا گویا سوئمنگ پول کے ساتھ ساتھ مظہر نے آسمان کے ایک ٹکڑے کو بھی قید کر لیا ہو۔ اور آسمان قبضے میں ہو تو کس کافر کا جی نہیں چاہے گا کہ وہ اس گز بھر آسمان پر ہی چہل قدمی کرنے کی حسرت پوری کر لے۔

مظہر خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرتا اوپر ہی اوپر کو اٹھتا چلا جا رہا تھا بلندیوں پر پرواز کر رہا تھا۔ خدا نے یہ دن دکھایا تھا جب اس کا برسوں پرانا خواب تعبیر بن کر اس کی آنکھوں کے سامنے موجود نظر آ رہا تھا۔ اس کا اپنا ذاتی سوئمنگ پول اس کے پاس تھا۔ اس کے لیے وہ جتنی بھی خوشی مناتا کم تھا۔ بچپن سے تو نہیں مگر جوانی میں کالج کے زمانے اس نے اٹھتے بیٹھتے اس خواب کو ہر دم اپنا ساتھی پایا تھا۔

گجرات شہر کے ایک نواحی چک سے نکل کر جب وہ لاہور شہر کے بڑے سے میڈیکل کالج میں داخل ہوا تو وہ بالکل ایک معصوم سا گاؤں کا لڑکا تھا۔ بڑے شہر میں آنے کی گھبراہٹ اور نئی جگہ نئے لوگوں سے ناواقف ہونے کی وجہ سے وہ شروع شروع میں اکھڑا اکھڑا سا محسوس کرتا تھا۔ اس وقت اس کی حالت بالکل اس مرغی کے بچے کی مانند تھی جو پہلی بار مرغی کے پروں کے نیچے سے نکل کر باہر کی دنیا دیکھتا ہے ڈرا ڈرا سہما سہما۔ جب پہلی بار اسے میڈیکل کالج کے ہاسٹل میں تن تنہا رات گزارنی پڑی تو اسے احساس ہوا کہ وہ اب تک اپنی ماں کا چھوٹا سا بچہ تھا اور کچھ نہیں۔ اس رات سے پہلے کی زندگی کی ہر رات اس نے اپنی ماں کے ساتھ سو کر گزاری تھی۔ کہاں وہ ماں کا نرم گرم مہربان لمس اور کہاں اب ایک کھردرا تنہا کمرہ اور محبت سے خالی بستر۔ ساری رات وہ اپنی ماں کے دوپٹے کی خوشبو یاد کرتے خاموشی سے آنسو بہاتا رہا۔ اسے یہ بھی ڈر تھا کہ اگر ہاسٹل کے کسی لڑکے نے اسے یوں چھپ چھپ روتا

دیکھ لیا تو اس کا بڑی بری طرح مذاق اڑائیں گے اور اس کا وہاں رہنا دوبھر کر دیں گے۔

اپنے ساتھی دوسرے لڑکوں کو دیکھتا تو سوچتا یہ سب لڑکے کس طرح سے ہنستے' بولتے' خوش باش رہ کر وقت گزارتے ہیں۔ کیا انہیں اپنے اپنے گھر' اپنے گاؤں' یاد نہیں آتے؟ وہ اپنے ماں باپ بھائی بیٹوں کے بغیر کس طرح آسانی سے رہ لیتے ہیں؟ پچھلا سب کچھ بھول جانا' بھلا دینا' ان سب کے لیے اتنا آسان کیسے ہو کر رہ گیا تھا؟

ہر جمعرات کی شام' وہ باقاعدگی سے اپنے گاؤں جانے کے لیے ہاسٹل سے نکل کر سٹیشن جا کر ویگن میں سوار ہوتا تاکہ جمعہ کی چھٹی اپنے گھر والوں کے ساتھ بتا سکے۔ راستہ کچھ ایسا لمبا تو نہ تھا۔ لیکن اسے بہت لمبا لگتا۔ اپنے گھر' گاؤں' یار بیلیوں کے حسین تصورات میں ڈوبا وہ ہچکولے کھاتی بس میں بیٹھا اونگھتا رہتا۔

اس کی آنکھیں تھوڑی کھلی اور تھوڑی بند رہتیں۔

تھوڑی کھلی اس لیے کہ کہیں وہ نیم خوابی کے عالم میں اپنی ویگن کا سٹاپ مس ہی نہ کر دے اور تھوڑی بند اس لیے تاکہ وہ اس اذیت سے اپنی جان کو کچھ کچھ بچا سکے کہ ابھی اتنا راستہ اور پڑا ہے۔ اسی طرح کے چھوٹے چھوٹے میٹھے کھٹے دھوکے اور تسلیاں دیتے وہ اپنے من کو بہلائے رکھتا اور راستہ کٹ جاتا۔ گاؤں آتا تو وہ جلدی جلدی اپنا سفری بیگ تھامے' دوڑ کر چاچا برکت کے تانگے پر سوار ہو جاتا۔ چاچا برکت اسے بچپن سے ہی اپنے تانگے پر مفت سیر کروا دیا کرتا تھا۔ اسے مظہر سے ہمیشہ سے لگاؤ رہا تھا۔

چاچا! تجھے کیسے خبر ہوئی کہ میں اسی بس سے اور اسی وقت اتروں گا؟ مظہر لاڈ سے پوچھتا۔ تو چاچا ہنس کر جواب دیتا۔

لو بھلا مجھے کیسے خبر ہو سکتی تھی؟ وہ تو بس یونہی کھڑا تھا' تانگہ اتفاق سے خالی تھا۔ سواری ہی کوئی نہیں مل رہی تھی تو کیا کرتا.... بس کھڑا رہا اور تم آ گئے!

چاچا جھوٹ بول جاتا جس پر وہ دونوں مل کر ہنس پڑتے اور مظہر لپک کر سوار ہو جاتا۔ اپنی گھوڑی سندری دوڑاتے دوڑاتے چاچا اسے ہفتے بھر کی گاؤں کی خبریں سنانے لگ جاتا۔ کس کی بیٹی کی شادی کس کے ساتھ ہوئی۔ کس کے دیاہ کا کھانا بدمزا نکلا' کون کھیتوں میں کس کے ساتھ پکڑا گیا اور کس کے بیٹے نے شہر سے اب کی بار ماں باپ کو زیادہ پیسے بھیجے۔

ان دنوں بیرون ملک جانے کا اتنا رواج نہیں ہوا تھا اس لیے لوگوں کے کماؤ پوت شہروں سے ہی اپنے ماں باپ کو پیسے بھیجا کرتے تھے۔

باتیں کرتے کرتے جھٹ سے مظہر کا گھر آ جاتا' جہاں اس کی پیاری ٹھنڈی میٹھی چھاؤں جیسی ماں اور لاٹ صاحب جیسا نخرہ

رکھنے والا ابو اسے دیکھ کر صدقے واری ہونے لگ جاتے۔

اماں اسے ہفتے بھر کا بھوکا سمجھ کر کھلانے پلانے لگ جاتی اور ابو اس کی پڑھائی کے متعلق سوالات کرتے کرتے' اسے گاؤں کے حالات بھی بتائے جاتے۔

ان کی زمینوں کو کلر کھا رہا تھا۔ ابا چاہتے تھے کہ اپنی زمینیں جس طرح بھی ہوں بیچ کر شہر چلے جائیں اور اپنے بیٹے کے ساتھ رہیں۔ مگر ایسا کرنا ابھی کچھ اتنا آسان نہ تھا۔ زمینوں کا گاہک ان کی مرضی کی قیمت دینے کو تیار نہ ہوتا تھا اور اونے پونے بیچنے کو ان کا بھی جی نہیں چاہتا تھا۔

بس بیٹا! ہم تو دن رات تیرے ڈاکٹر بن جانے کا خواب دیکھتے ہیں۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ دن جلد لائے اور ہم تیرے ساتھ ہی رہیں۔ اس مرتے ہوئے گاؤں' اس کی گندی سیاستوں کو گولی ماریں اور سکھ چین سے زندگی گزاریں؟

ابا مزاجاً شہری تھے۔ انہیں تو ان کے آباؤ اجداد نے نسل در نسل زمینوں کے چکروں میں پھنسا دیا اور خود قبروں میں سکون سے جا لیٹے ورنہ ابا خود اپنی پسند سے کبھی بھی گاؤں میں رہنے کو تیار نہ ہوئے۔

انہیں شہر کی اونچی اونچی عمارتیں' سینما بینی' سیر تفریح بہت اچھی لگتی تھیں اس لیے جب کبھی عدالت کچہری یا کسی اور کام سے شہر جانا پڑ جاتا تو ہمیشہ دو تین دن اوپر ہی لگا کر لوٹتے تھے۔ شہر انہیں جیسے روک سا لیتا تھا۔

گوالمنڈی کی مچھلی' لوہاری کا فالودہ' یار دوستوں سے ملنا ملانا' ایک سے بعد ایک چسکہ پورا کرتے۔ چٹکیوں میں وقت گزر جایا کرتا تھا۔ گاؤں بڑی بے دلی سے واپس آتے۔ ان کی ہنگامہ پرور طبیعت گاؤں کے' ٹھہرے پانی جیسے سکون اور گھسی پٹی بوسیدہ کہانیوں سے اکتا جاتی اور وہ کھوئے کھوئے سے رہنے لگتے۔

اماں' جو ان کی طبیعت سے واقف تھیں کبھی کبھی جھلا اٹھتیں۔

اب واپس آ جایئے اصلی دنیا میں چوہدری صاحب! مشتاق ماما کب سے ٹیوب ویل کے پانی کی تقسیم کا جھگڑا نپٹانے کے لیے چکر پر چکر لگا رہا ہے۔ اٹھیں اور جا کر اسے مل تو آئیں! آخر ہمسائیگی بھی کوئی چیز ہے۔

ابا جی انہیں ان کے اتنے حسین خواب سے جگا دینے پر برا سا منہ بنائے اور اٹھ کر پگڑی سر پر جما کر بادل ناخواستہ جوتا تلاش کرنے لگ جاتے۔

مظہر چھٹی پر آتا تو گھر میں گویا بہار سی آ جاتی۔

اس کی بہن شمیم کی لاتعداد ڈھیر ساری قلانچیں بھرتی سہیلیاں حیرانگی اور تجسس بھری شرمیلی آنکھوں سے اسے دیکھتی اور پلکیں جھپکاتی رہ جاتیں۔ بہانے بنانے شمیم سے ملنے یا اسے بلانے کے لیے آنے لگتیں تو اماں ابا بھی زیر لب مسکرانے لگتے۔ ان لڑکیوں کی ماؤں کو بھی شمیم کے گھر بار لڑکیاں بھیجنے پر ایسا کوئی خاص اعتراض نہ ہوتا کیونکہ آخر کو شمیم کا بھائی ڈاکٹر بننے والا تھا اور اس کے ڈاکٹر بننے میں ایسی کوئی خاص دیر بھی نہ تھی۔

مظہر اپنے بچپن کے دوستوں کے ہمراہ ٹبے کے پرلی طرف والے چھپڑ میں خوب نہاتا۔ چھپڑ کا پانی صاف تھا حالانکہ اس میں بھینسیں بھی نہا لیا کرتی تھیں مگر مظہر اور اس کے دوستوں کو کبھی اس پر اعتراض نہ ہوا تھا۔ بچپن سے لے کر جوانی تک چھپڑ میں نہاتے نہاتے مظہر کو اچھی خاصی تیراکی آ گئی تھی۔ اس لیے جب اس نے میڈیکل کالج کا سوئمنگ پول دیکھا تو خوشی سے اس کا دل جھوم اٹھا۔ اس نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ وہ اتنے صاف ستھرے باقاعدہ قسم کے سوئمنگ پول میں بھی کبھی نہا سکے گا۔ وہ پڑھائی کے بعد کا سارا وقت سوئمنگ پول میں گزارنے لگا اور پھر سوئمنگ میں اتنا مشاق ہو گیا کہ کالج کی طرف سے سوئمنگ کے مقابلوں میں زور شور سے حصہ لینے لگا۔ اور کئی انعامات بھی جیت ڈالے۔ سوئمنگ اب اس کا جنون بن چکی تھی۔

میڈیکل کالج کے سال آہستہ آہستہ طے ہونے لگے۔ آخری سال تک پہنچتے پہنچتے اس کے معمولات میں کچھ تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ اب وہ گھر ہر جمعرات کے بجائے ہر دوسری تیسری جمعرات کو جانے لگا تھا۔

کالج کے سوئمنگ پول میں نہانے کی اتنی عادت پڑ گئی تھی کہ اب گاؤں کے چھپڑ کا پانی اسے گدلا' گندا اور جراثیم سے پر لگنے لگا تھا۔ اس کے بچپن کے دوست جب اسے نہانے کے لیے لینے آتے تو وہ کہتا۔

یار مجھے تو چھپڑ میں نہانے کے بعد جسم پر کھجلی سی ہونے لگتی ہے۔

اب وہ ان کے ساتھ بیٹھ کر گپ شپ کرنے سے بھی کترانے لگا تھا۔ دراصل اب ان میں سے آتی لسی اور گوبر کی ہلکی ہلکی باس اسے کالج کے دوستوں کے کولون کی مہک یاد دلا دیتی تھی۔ وہ کتاب آگے رکھ کر پڑھائی کا بہانہ بنا لیتا' اور وہ مایوس لوٹ جاتے۔

میڈیکل کالج کے آخری سال کے آخیر تک پہنچتے اس کے تخیلات میں خوابوں میں' ایک چاندی کی دیواروں والے خوبصورت محل نما گھر نے بھی قبضے جمانے شروع کر دیئے تھے۔

اس خوبصورت گھر میں بڑے بڑے لان' کمرے اور ایک سوئمنگ پول بھی موجود تھا۔ کمروں میں چلنے پھرنے والی ایک حسین مورت یعنی اس کی بیوی اور ایک دو شراتی بچے بھی نظر آتے تو اس کے تن بدن میں گرمی سی پیدا ہونے لگتی۔

ایک کمرے میں اس کے ماں باپ بھی آرام چین سے رہتے نظر آتے۔ اور اس خواب کو جلد از جلد پورا کرنے کے لیے وہ انتہائی جانفشانی کے ساتھ پڑھائی کرنے لگ جاتا۔

میڈیکل کالج کا آخری سال اس کے ماں باپ کی آرزوؤں اور امیدوں کی ناآسودگی کا بھی آخری سال تھا۔ ان کی تنگدستی کے دن دور ہونے والے تھے۔ مجو کے ڈاکٹر بنتے ہی ہم شہر چلے جائیں گے۔ یہ ٹوٹا پھوٹا گھر بیچ کر کسی اچھی بارونق' ماڈرن آبادی میں نیا سا گھر لے لیں گے۔ ٹھیک ہے نا؟

ابا حقے کی گڑگڑاہٹ روک کر اماں سے کہتے۔

ہاں ٹھیک ہے! ہم بھلا یہاں اکیلے رہ کر کیا کریں گے؟ آخر شمیم کے مستقبل کا بھی تو ہمیں ہی سوچنا ہے۔ یہاں گاؤں میں رہے تو وہی اپنے پرانے' دقیانوسی' لڑاکے رشتہ داروں کو لڑکی دینا پڑ جائے گی۔ شہر میں تو..... ہوسکتا ہے... میرا مطلب ہے مظہر کے ڈاکٹر دوست بھی گھر آیا کریں گے... ہوسکتا ہے... اماں کی آنکھوں میں امید کے جھلملانے لگتے۔ شمیم بھی پردے کے پیچھے چھپی ایسی باتیں سن کر مسکرانے لگ جاتی۔

مگر نہ جانے کیسی آندھی آئی کہ سب کچھ' ان کے سارے خواب بھک سے اڑا کر لے گئی اماں ابا اور شمیم تو سمجھ ہی نہیں سکے کہ ان کے ساتھ ہوا کیا ہے مگر مظہر کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اس کے اپنے ذاتی' چاندی کے محل جیسے گھر کے خواب کے پورا ہو جانے کی باری اس کی توقع سے بھی جلدی آ گئی تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ ڈاکٹری پاس کر کے ہسپتال میں ہاؤس جاب بھی کر سکتا اسے امریکہ جانے کا ویزا مل گیا۔ اس کے دوستوں کے جتھے کے جتھے امریکہ کو روانہ ہو رہے تھے تو بھلا وہ کیونکہ پیچھے رہتا۔ امریکہ ایک سنہرے مستقبل کا خواب تھا جو اب حقیقت بننے جا رہا تھا۔

اماں ابا کو تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ انہوں نے کتنے ہی سالوں سے صرف ایک خواب کی پرورش کی تھی کہ وہ سب مل جل کر ایک اچھے سے گھر میں اکٹھے رہیں اور بس۔ وہ ان کا محبوب خواب ان سے کس طرح چھن سکتا تھا؟ انہیں اکیلا چھوڑ کر بھلا کیسے جا سکتا تھا؟

لیکن آپ سمجھنے کی کوشش کریں نا! میں امریکہ جا کر وہی روپیہ تیزی سے کما لوں گا جو یہاں کماتے کماتے میں شاید بوڑھا ہو جاتا۔ اس لیے ایک طرح سے اچھا ہی تو ہوا ہے۔ آپ لوگ کچھ سال اور صبر کر لیں۔ پھر میں آپ کو جلدی ہی اپنے پاس بلوا لوں گا اور ہم اکٹھے رہیں گے۔ آپ مجھے موقعہ تو دیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میں واپس آ کر یہیں ایک شاندار پریکٹس کا آغاز کر دوں یہیں

آپ کو وہ سب آسائشیں دے دوں جس کے آپ حقدار اور میں خواہشمند ہوں۔

مظہر اپنے بوڑھے ماں باپ سے ان کے پرانے خوابوں کے ڈبے لے کر انہیں نئے نکور خوابوں کے بند ڈبوں کا تحفہ ہاتھ میں تھما کر امریکہ جانے والے جہاز میں سوار ہو گیا۔ اماں ابا نے اس کے جانے کے بعد ڈبے کھولے۔ ان میں خواب تو کم و بیش پرانے ہی تھے لیکن ان پر نیا ملمع اور قلعی چڑھا دی گئی تھی۔ ڈبے پر رنگین کاغذ اور گوٹا بھی بالکل نیا تھا۔ اب انہوں نے امریکہ سے آنے والے نیلے خطوں کا انتظار شروع کر دیا۔ کچھ لوگوں کی قسمت میں صرف انتظار ہی لکھا ہوتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ انتظار کی نوعیت البتہ بدلتی رہتی ہے۔

پھر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے' جب انتظار ہی زندگی کی وہ واحد مثبت طاقت بن کر رہ جاتا ہے جو وقت کے تپتے ریگستان میں انہیں گرتے پڑتے' مگر بار بار اٹھ کر چلنے پر مجبور کرتا ہے' کیونکہ منزل ہمیشہ ہی ریگستان کے اس پار سے چمکتے ہوئے سراب کی مانند انہیں اپنی طرف بلاتی نظر آتی ہے۔ یہ انتظار کچھ زیادہ ہی لمبا ثابت ہو رہا تھا۔ سالوں کے بعد سال یوں گزرتے چلے گئے جس طرح بارش میں ایک قطرے کے بعد دوسرا قطرہ تواتر کے ساتھ چلا آتا ہے۔

مظہر نے روپیہ پیسہ بھیجنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ اماں ابو نے گاؤں والے مکان کی حالت بہت اچھی کر لی۔ باغ بھی لگوا لیا' سوچتے تھے جب تک بیٹے کے ساتھ نہیں رہنے لگتے اپنے پرانے مکان کو بہتر بنا لینے میں ہی کیا حرج ہے۔

مکان کے بہتر ہوتے ہی شمیم کے لیے ایک اچھے گھر سے رشتہ بھی آ گیا اور شمیم اپنے پیا کے دیس سدھار گئی۔

مظہر دو تین سال بعد پاکستان کا باقاعدگی سے چکر لگاتا' اپنے ماں باپ کو ڈھارس دیتا اور پھر امریکہ لوٹ جاتا۔

ابا جو ہمیشہ سے ہنگاموں' رونقوں اور رنگینوں کے شہر لاہور میں رہنے کے تصور میں گم رہتے تھے اب امریکہ کے خیال سے دل بہلاتے بہلاتے بوڑھے ہونے لگے۔ انہیں پتہ تھا مظہر نیویارک شہر میں رہتا ہے اس لیے وہ اکثر اخبار و رسالوں سے نیویارک کے بارے میں مضامین ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھتے اور معلومات اکٹھی کرتے رہتے۔ سوچتے' لاہور کے بدلے نیویارک' کچھ ایسا برا سودا تو نہیں۔ خوب مزا آئے گا وہاں تو رہ کر۔

اماں البتہ اب اس معاملے میں خاموشی اختیار کر چکی تھیں۔ ان کی بیٹی شمیم اور اس کے بچے ان کا دل بہلانے کو اکثر آتے جاتے رہتے تھے اس لیے وہ بیٹے کی یاد کو کلیجے کی ہوک سمجھ کر اندر ہی اندر دبائے رکھتیں۔ اپنے میاں کی حالت پر انہیں ترس آتا تھا۔ انہیں دیکھ کر سوچتی رہتیں اور دعا کرتیں' یا اللہ ان کا بیٹا انہیں امریکہ ضرور بلا لے۔ جتنا انہیں بڑے بڑے شہروں میں رہنے کا

شوق تھا اتنا ہی بڑے شہر انہیں اپنے سے دور رکھنے پر تلے ہوتے تھے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اماں کے دل میں امریکہ جا کر بس جانے کی امید دم توڑنے لگی۔ کیونکہ مظہر نے چند ایک سالوں سے اس موضوع پر بات کرنا تقریباً ختم کر دی تھی۔ شاید اس میں اس بات کا بھی کوئی دخل تھا کہ مظہر نے وہیں ایک امریکن لڑکی سیلی سے شادی کر لی تھی اور اب اس سے اس کے دو لڑکے بھی تھے۔

مظہر نے لکھا تھا کہ سیلی بہت اچھی لڑکی ہے۔ شادی سے پہلے اس نے اسے نیویارک کی سب سے بڑی مسجد میں لے جا کر باقاعدہ مولوی کے ہاتھ پر اسلام قبول کروایا تھا اور اس کا اسلامی نام سلمیٰ رکھا گیا تھا۔

اماں ابا نے سن کر فوراً ہی لال عروسی جوڑا بھجوا دیا اور تاکید کی کہ شادی پاکستانی رسم و رواج کے مطابق کی جائے اور لال جوڑا ہی دلہن کو پہنایا جائے۔

سیلی اور مظہر کی شادی کی تصویریں آئیں تو اماں ابو نے انہیں چوما، آنکھوں سے لگایا۔ سارے گاؤں کو دکھایا اور اتنی خوبصورت گوری چٹی دلہن پر خوب داد پائی۔

سفید روایتی کرسچن عروسی لباس میں دلہن واقعی بہت پاکیزہ اور معصوم لگ رہی تھی۔ مظہر نے بھی سوٹ زیب تن کیا تھا اور ہوٹل کی تصاویر سے اندازہ ہو رہا تھا کہ شادی کی پارٹی بہت زبردست انداز میں دی گئی تھی۔

کچھ عرصے بعد جب پھر سے تصاویر آئیں تو انہوں نے دیکھا کہ ان کی بہو سلمیٰ نے اب کی بار شلوار قمیض پہن رکھی ہے۔ اماں ابا نے سارے گاؤں میں فخریہ طور پر یہ تصویریں دکھائیں اور اترا کر بولے۔

بھئی آخر اپنے مجو نے اسے اپنے طور طریقے پر ہی تو چلانا ہے۔ مسلمان کر کے شادی کی ہے اور اہل کتاب تو وہ پہلے سے تھی اس لیے سمجھو کہ ایک عیسائی کو مسلمان کر کے اس نے ایک نیک کام سرانجام دیا ہے۔

لوگ مطمئن ہو گئے۔ اماں ابا کی عزت رہ گئی۔

کچھ سال اور بیت گئے۔

لوگ جب کچھ چہ میگوئیاں کرتے اماں بڑے حوصلے سے کہتیں۔ نہ بہن بڑی اچھی ہے ہماری بہو! آٹھ سال شادی کو ہونے کو آئے، مجال ہے اس نے مجو پر کوئی غلط اثر ڈالا ہو۔ برابر اسی طرح ہمیں ماہوار خرچ بھیجتا ہے جس طرح شادی سے پہلے بھیجتا تھا۔ یہی تو فرمانبرداری ہے اس کی۔ اگر کوئی اور ہوتی تو اب تک تو کان بھر کر ہمارا خرچ بند کروا چکی ہوتی۔ بچوں کے بھی عید کارڈ اور تصویریں

آتی رہتی ہیں۔ ہمیں باقاعدگی سے سلام پیار لکھواتے ہیں۔ ہمیں آخر اس عمر میں اور کیا چاہیے۔ عزت اور عزت کی دو روٹیاں اللہ اللہ خیر صلا۔ اور وہ ہمیں مل رہی ہیں بس جی اللہ کا بڑا کرم ہے! اماں کو اپنے دوپٹے کے پلو سے چپکا کالج جاتے وقت رونے والا مجو یاد آتا تو خوامخواہ اپنے پرانے صندوقوں کو الٹ پلٹ کرنے لگ جاتیں جیسے کچھ تلاش کر رہی ہوں مگر پتہ نہ چل رہا ہو کہ کھویا کیا ہے۔

اب تو انہیں ایسے لگنے لگا تھا جیسے ان کا کوئی بیٹا تھا ہی نہیں۔ وہ کوئی دور پار کا رشتہ دار تھا جو دور پار کے کسی ملک میں قیام پذیر تھا' جس کا کبھی کبھار خط' ڈرافٹ' کارڈ' تصویریں آجایا کرتی تھیں۔ مگر اک انجانی سی آس تھی جس کا سلسلہ ٹوٹے نہیں ٹوٹتا تھا۔

پہلے پہل مظہر لکھتا تھا کہ وہ فلیٹ میں رہتے ہیں اور فلیٹ میں اتنی جگہ نہیں ہوتی کہ زیادہ آدمی آرام سے رہ سکیں۔ پھر اس نے لکھا کہ اب وہ شہر سے باہر ایک چھوٹے سے قصبے میں شفٹ کر رہا ہے۔ وہاں سکون اور چین کے علاوہ بڑے بڑے خوبصورت' کئی کئی ایکڑ زمین پر پھیلے ہوئے گھر ہیں جن میں سے اس نے ایک پسند کر کے خرید لیا ہے۔

سترہ سال امریکہ میں گزار لینے کے بعد اب وہ مکمل طور پر وہاں سیٹل ہو چکا تھا اس لیے اب اس نے ایک بڑا گھر لینے کے بعد انہیں یہ اطلاع دے کر حیران کر دیا تھا کہ وہ انہیں اب کی بار گرمیوں میں امریکہ بلانے کا پکا ارادہ رکھتا ہے۔

چونکہ پچھلے چند سالوں سے مظہر نے انہیں یہ کہنا چھوڑ دیا تھا کہ وہ انہیں مستقلاً بلالے گا اس لیے وہ اچھی طرح جانتے اور سوچتے سمجھتے تھے کہ اب وہ صرف وہاں وزٹ کے لیے ہی جائیں گے۔ مل کر واپس آجائیں گے۔ ایک دوسرے سے اس موضوع پر بات کرتے تو یہی کہتے کہ ہم اس عمر میں اپنا ملک' اپنے لوگ' اپنے رشتہ دار' دوست چھوڑ کر جا بھی کیسے سکتے ہیں۔

آخر شمیم بھی تو ہے! میں تو اپنی بچی کو اکیلی چھوڑ کر کبھی نہ جاؤں' وہاں مستقل رہائش کے لیے! اماں' ابا کو خالی خولی سمجھانے لگتیں۔

ابا پہلے ہنکارے بھرتے پھر کہتے۔

ہاں اپنے سنگی ساتھیوں کے بغیر تو میں بھی اس عمر میں اب نہیں رہ سکتا بھئی۔ وہ اگر ہمیں بہت مجبور کر کے روک لے تو بھی کئی بار سوچنا پڑے گا مجھے بھی! وہ بھی بھاروں پر پڑ جاتے اور اشارہ اپنے یاروں' دوستوں کی اس منڈلی کا ذکر کرتے جو ہر شام مغرب کے بعد بڑے پیپل کے نیچے بچھائے گئے بڑے سے منجے پر جما کرتی تھی۔

شام ہوتے ہی وہاں ایک رنگا رنگ محفل شروع ہو جاتی۔ گاؤں کے قصے' کہانیاں' لڑائیاں' سکینڈل بھی زیر بحث آتے۔ کبھی کبھار کوئی منچلا' عشق کی پیڑ اول میں چھپائے' ہیر وارث شاہ سنانے آجاتا تو محفل کو چار چاند لگ جائے۔

ہنی! کیا واقعی تمہارے والدین اس بار گرمیاں گزارنے یہاں آرہے ہیں؟

مظہر کی بیوی سلمی نے اوون میں سے کیک نکالتے ہوئے پوچھا

ہاں ڈیئر! میرا خیال ہے اس بار انہیں بلوا ہی لیں تا کہ یہ کام بھی پورا۔ ورنہ یونو! ساری عمر میرے سر پر یہ تلوار لٹکی رہے گی کہ میرے والدین نے یہاں آنا ہے یہاں آنا ہے!

ہاں یہ تو ٹھیک کہتے ہو۔ جو کام ہونا ہے جو جائے تا کہ ہم لوگ پھر سکون سے اپنا بھی کچھ پلان بنا سکیں۔ تمھیں پتہ ہے نا اس سال بچوں کو ڈزنی لینڈ اور ماؤنٹ رش مور دکھانے کا وعدہ کیا ہوا ہے؟

سیلی نے یاد دلایا۔

یاد ہے بابا سب یاد ہے! تم فکر کیوں کرتی ہو۔ میں اپنے بچوں کی خوشی کے لیے انہیں ان کی پسندیدہ جگہوں پر بھلا کیوں نہ لے جاؤں گا۔ ایسا کیسا ممکن ہے!

سیلی بچوں کو لے کر پیانو سبق کے لیے ان کی پیانو ٹیچر مسز راجر کے گھر چلی گئی اور مظہر، کچن میں رات کا ڈنر بنانے کے لیے کھانے کا سامان چیک کرنے لگا۔

سامان کاؤنٹر پر سیٹ کر کے وہ گھر کی صفائی میں جٹ گیا۔ وہ اور سیلی گھر کی صفائی خود ہی مل جل کر کرتے تھے۔ ہیوی کلینگ کے لیے البتہ کبھی کبھار ایک میڈ بلوائی جاتی تھی۔

صفائی کرنے کے بعد وہ اپنے بڑے سے ڈرائنگ روم کے صوفے پر بیٹھ کر آرام کرنے لگا۔ اسے اپنے نئے بڑے سے گھر کو دیکھ کر ایک عجیب سی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ کہاں سے چلا تھا اور کہاں آ گیا تھا۔ اسے اپنے اوپر فخر سا محسوس ہونے لگا۔

پتھر اور ماربل سے ملا کر تعمیر کیے گئے اس گھر کی شان ہی نرالی تھی۔ اس چھوٹے سے ٹاؤن میں اس سے زیادہ خوبصورت اور مہنگا گھر شاید ہی کوئی اور رہا ہوگا۔ اور قیمت بھی بہت مناسب تھی صرف ایک لاکھ ڈالر۔ رقم کی ادائیگی بھی اس پر بوجھ نہیں بنی تھی کیونکہ بیس ہزار ڈاؤن پے منٹ دے کر باقی رقم بینک نے مارگیج کی تھی۔ جس کے تحت پندرہ سال میں گھر کی پوری رقم کی قسطوں میں ادائیگی ممکن ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے مظہر نے بڑی آرام سے یہ گھر خرید لیا تھا اور اب اسے وہ اس کی فیملی بھرپور طریقے سے انجوائے کر رہے تھے۔

گھر میں تین بیڈ روم نیچے تھے اور دو اوپر کی منزل میں جو گیسٹ روم کے طور پر استعمال کیے جا سکتے تھے۔ بڑا سا خوبصورت ماڈرن اشیاء سے مزین کچن تھا جس میں کھانا پکانا عین راحت محسوس ہوتا تھا۔

ڈرائنگ روم کی بڑی سی ونڈو سے نیچے جاتی ہوئی مڑی تڑی سڑکوں کا نظارہ اتنا دلکش دکھائی دیتا تھا کہ مظہر گھنٹوں وادی کے حسن پر نظریں ٹکائے مبہوت کھڑا رہتا۔ رات کو جب چاروں طرف سناٹا اور تاریکی کا راج ہو جاتا تو جلتی بجھتی بتیاں ایک طلسمی انداز میں ٹمٹمانے لگ جاتیں۔ یوں لگنے لگتا جیسے جگنوؤں کے ان گنت قافلے اپنی منزلوں کی جانب رواں دواں ہوں۔

سارا گھر ایک پروقار پرشکوہ محل کی مانند تھا مگر اس کا جو حصہ مظہر کو سب سے زیادہ عزیز تھا وہ اس کا طالب علمی کے زمانہ کا خواب' ایک وسیع و عریض سوئمنگ پول تھا۔ گھر کے پچھلے حصے میں' جہاں باونڈری کے ساتھ ہی پہاڑیاں شروع ہو جاتی تھیں۔ یہ پول جھلملاتے ہوئے نیلے صاف پانی سے مزین ایک نیلا قیمتی جوہر دکھائی دیتا۔

سوئمنگ پول کے دو حصے تھے۔ ایک کم گہرا اور ایک زیادہ گہرا اور ایک مضبوط ریشمی رسی ان دونوں کی تقسیم کی نشاندہی کرنے کے لیے پول کے بیچوں بیچ بندھی رہتی تھی۔

گہرے پانی والے حصے کے سرے پر ایک لمبا سا' لچکدار ڈائیونگ بورڈ بھی نصب تھا جسے غوطہ خوری کے لیے استعمال کیا جا سکتا تھا۔

پول کے ساتھ ساتھ اس کے لوازمات بھی خرید کر رکھے گئے تھے جن میں کلورین کی وافر مقدار میں سپلائی اور ایک پول ویکیوم کلینر سرفہرست تھے۔

سردیوں میں تو اسے ہر خیر پول کے لیے بنے ہوئے ایک خاص قسم کے ترپال نما کور سے ڈھکنا ہی کافی تھا مگر گرمیوں میں اس کی دیکھ بھال کے لیے خاصے انتظامات کرنے پڑتے تھے۔

مظہر صبح سویرے ناشتے کے بعد پول کی صفائی کے لیے لمبے لمبے ربڑ پائپ والا ویکیوم کلینر لگا کر پانی میں سے رات بھر کے گرے ہوئے کیڑے مکوڑے پتے اور الم غلم صاف کرتا۔ اگر کچھ کوڑا بچ جاتا تو بڑی سی جالی والی ایک چمچا نما چیز ڈال کر اس سے خود ہاتھوں سے نکال دیتا۔ اس کے بعد واٹر ہیٹر آن کر دیتا کیونکہ گرمیوں کے موسم میں بھی پانی کبھی اتنا گرم نہیں ہوتا تھا کہ اس میں یونہی جا گھسیں۔ اسے نیم گرم ٹمپریچر پر لانے کے لیے واٹر ہیٹر کی ضرورت پڑتی تب جا کر وہ کہیں نہانے کے قابل ہوتا گھر میں پول کے ہونے کی سب کو بہت خوشی تھی۔

غم تھا تو صرف ایک کہ آؤٹ ڈور پول تھا اور گرمیوں کا موسم اتنا مختصر اور کم گرم کہ وہ اسے زیادہ عرصے کے لیے استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ مئی سے لے کر جولائی تک یوں تو موسم گرما ہی ہوتا ہے۔ لیکن ویسٹرن نیویارک جیسے ٹھنڈے علاقے میں ہر شہر اور ہر قصبے

میں اتنی معمولی سی گرمی پڑتی ہے کہ لوگ گرمی کے لیے ترستے ہی رہ جاتے ہیں۔ اور سوئمنگ کے لیے تو معمولی سی گرمی سے کام نہیں چلتا۔ گنتی کے چند ہی ایسے گرم دن آتے ہیں جن میں درجہ حرارت اسی یا نوے ڈگری تک پہنچ جاتا ہے۔ اس لیے ایسے دنوں کو بہت خاص تصور کر کے ان ہی میں سارے فنکشن' پارٹیاں اور پکنکیں رکھی جاتی ہیں' ایک دوسرے سے میل ملاقات کی جاتی ہے تا کہ گرمی کا جشن منایا جا سکے۔

مظہر اور اس کی فیملی روز ٹی وی پر موسم کی پشین گوئی سنتے اور امید کرتے کہ ٹی وی گرم دنوں کی نوید دے گا' کیونکہ جس دن ذرا سی بھی گرمی ہوتی اس دن سوئمنگ پول میں نہانے کا بہت لطف آتا اور سوئمنگ پول تو پوری فیملی کی جان تھا۔

ان کے گھر کے بیرونی حصے کے خاتمے کے ساتھ ہی ننھی ننھی خوبصورت سرسبز پہاڑیاں شروع ہو جاتی تھیں۔ اس علاقے میں قدرتی حسن کی اتنی بہتات تھی کہ کبھی کبھی تو ایسا لگتا جیسے اللہ میاں خود نیچے اتر کر اپنے ہاتھوں سے وہاں حسن' رنگ و بو کا چھڑکاؤ کر کے گئے ہوں۔ گرمی والے دن مظہر اس کی بیوی اور بیٹے پورا دن پول کے کنارے گزارنے کا پروگرام رکھتے۔ پہلے وہ چاروں جی بھر کر سوئمنگ کرتے۔ پھر تین چار بجے کے قریب سوئمنگ کا سلسلہ بند کر دیتے۔

اگلے پروگرام کے تحت وہ سب ٹریک شوز پہن کر ہائکنگ کے لیے پہاڑیوں میں بنی ننھی منھی پگڈنڈیوں کی سیر کو نکل جاتے۔ چھوٹا بیٹا جنگلی سٹرابیریز اور دوسرے جنگلی پھول اکٹھا کرنے لگ جاتا اور بڑا اپنے باپ کے ساتھ اوپر ہی اوپر بڑھتے چلے جانے کی ریس لگا دیتا۔ واپسی میں وہ لوگ گھر آ کر اپنے جوتے اور جیکٹس اتارتے امریکن لوگوں کی طرح آتش دان کی جلتی آگ پر مارش میلوز سینک کر کھاتے اور ایک دوسرے کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف ہو جاتے۔

کبھی کبھی انہی پہاڑیوں پر سے کوئی آوارہ ہرن بھٹک کر نیچے اتر آتا اور ان کے سوئمنگ پول کی باؤنڈری کے اس پار حیرت سے کھڑا ادھر ادھر تاکنے لگتا تو سیلی اور مظہر جلدی جلدی اپنے بچوں کو بلا کر کھڑکی میں سے انہیں یہ نظارہ دکھا کر خوش ہونے لگتے۔

اماں اور ابا کے آ کر رہنے کا ایک چھوٹا سا مسئلہ یہ بھی تھا کہ سیلی اور بچے ان سے اردو پنجابی نہیں بول سکتے تھے۔ ابا تو خیر کچھ انگریزی بول لیتے تھے' لیکن اماں یس' نو سے زیادہ آگے نہ جا سکتی تھیں۔

مظہر نے اسی لیے ایک ہفتے کی چھٹی لے لی تھی تا کہ انہیں گھر پر خود اٹینڈ کر سکے۔ اور دونوں پارٹیوں کے درمیان رابطہ قائم کروا سکے۔

اماں ابا اپنے بیٹے کے وسیع و عریض بنگلے اور شان و شوکت کو دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ ان کا بیٹا اب اتنا بڑا

ڈاکٹر بن گیا تھا دونوں کی آنکھوں میں رب کا شکر آنسو بن کر چمکنے لگا۔

اپنے پوتوں کو دیکھ کر تو وہ خوشی سے کھل اٹھے۔ اتنے پیارے اور گورے چٹے تھے۔ رنگ کے معاملے میں چلو اچھا ہی تھا کہ اپنے مظہر پر نہیں گئے تھے۔ کیونکہ اس کا رنگ گندمی سے کچھ گہرا ہی تھا۔ نقش ونگار البتہ اس کے بہت اچھے تھے لیکن بچے ماں پر چلے گئے تھے جس کے نقش ونگار کچھ ایسے برے بھی نہیں تھے۔ فر فر انگریزی بولتے ہوئے امریکن بچے' اپنے دادا دادی کو کسی دوسرے سیارے سے آئی ہوئی مخلوق سمجھ کر کھنچے کھنچے سے رہتے تھے۔ مظہر نے انہیں گود میں بھر بھر کر اپنی اماں اور ابا کے قریب لا کر بٹھانے کی کئی بار کوشش کی مگر وہ ہر بار کوئی بہانہ بنا کر بھاگ کھڑے ہوتے۔

مظہر نے اپنے ماں باپ کو اپنے گھر کا گرینڈ ٹور دیا۔ ایک ایک چیز دکھائی ان سے امریکہ' اپنی زندگی' اپنے مسائل کی باتیں کیں۔ وہ بھی اس سے شمیم' اس کے بچوں' اپنے رشتہ داروں' اس کے پرانے دوستوں کی باتیں کرتے رہے جنہیں وہ مصنوعی دلچسپی سے سنتا رہا۔

ابا اس سے اپنی کلر زدہ زمینوں کے بارے میں پوچھنا چاہتے تھے کہ وہ کیا کریں؟ کیا وہ ان کے بک جانے اور اچھی قیمت ملنے کی امید میں وہیں' اسی حالت میں اپنی پوری زندگی انتظار کریں یا اس نے کچھ اور ان کے لیے سوچ رکھا تھا؟ گھڑی گھڑی وہ یہ بات سنجیدگی سے کرنے کے لیے موقعہ ڈھونڈتے' مگر ہر بار مظہر اتنا مصروف نظر آتا کہ چپکے رہ جاتے۔

کبھی وہ بچوں کو گیمز پر لے جا رہا ہوتا' کبھی سیلی کے ساتھ مل کر کچن میں کوکنگ کر رہا ہوتا اور کبھی اپنے لاڈلے سوئمنگ پول کی صفائی کرتا نظر آتا۔ ایک بار جب ابا نے سوئمنگ پول کے پاس جا کر ہی اس سے یہ بات کرنے کا حوصلہ پیدا کر لیا تو مظہر بات سن کر پل بھر کو خاموش ہو گیا۔

ابا آپ ایسا کریں جو بھی قیمت ملے بیچ دیں اور گاؤں سے نکلنے کی کریں۔ لاہور جا کر کوئی گھر وغیرہ کرائے پر لے لیں۔ خرچ تو میں آپ کو بھیج ہی رہا ہوں تو آپ کو کیا ضرورت ہے کہ آپ ان بیمار زمینوں کی راکھی کے لیے وہاں بیٹھے رہیں' اچھا ذرا یہ کلورین کی بالٹی تو مجھے پکڑائیے۔ پانی میں کلورین کی کچھ کمی ہو گئی ہے اور اس کی مقررہ مقدار رکھنا ضروری ہوتا ہے ورنہ پانی نہانے کے قابل نہیں ہوتا۔

ابا اس کی اپنی زمینوں کے بارے میں اتنی ہی دلچسپی دیکھ کر خاموش ہو گئے اور اسے کلورین سوئمنگ پول کے شفاف پانی میں مکس کرتے دیکھنے لگے۔ اتنا شفاف پانی تو انہوں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کبھی ان کی زمینیں بھی اتنی ہی کھری اور بے داغ ہوا کرتی

تھیں۔

کیا کبھی سوئمنگ پول کے پانی کو کلر کھا سکتا ہے؟ ابا اپنے آپ سے ہی بڑبڑا کر سوال کرنے لگے۔

رات اماں اور ابا اوپر کے گیسٹ روم میں لیٹے آپس میں ایک دوسرے سے یوں نظر چرا رہے تھے جس طرح دونوں ایک دوسرے سے اپنے اپنے قصور چھپا رہے ہوں۔ جس طرح دونوں ہی مجرم ہوں۔

انہیں اس پہاڑی وادی میں ڈھکے چھپے اس شاہانہ گھر' اونچے اونچے میپل کے درخت' سائیں سائیں کرتی خاموشی اجنبی مکینوں اور غیر غیر سے ماحول میں وحشت سی محسوس ہونے لگی تھی۔

نہ جانے یہ کس کا گھر تھا؟ وہ کہاں پڑے ہوئے تھے؟ جو کچھ بھی تھا' اپنا نہیں بلکہ غیر تھا۔

مجو تو سارا وقت سوئمنگ پول کی صفائی یا پھر اپنے بچوں کے ساتھ سوئمنگ کرنے میں ہی لگا رہتا ہے۔

ابا ہلکی سی شکایت کرتے ہوئے اماں سے بولے۔

آپ کو تو پتہ ہی ہے اسے بچپن سے ہی نہانے کا کتنا شوق تھا۔ سارا سارا دن ٹبے کے اس پار والے چھپڑ میں گھسا' بھینسوں کے ہمراہ نہاتا رہتا تھا۔ اب اللہ نے اسے اتنا خوبصورت سوئمنگ پول دے دیا ہے تو اچھا ہے نا۔ اللہ اسے اور ترقی دے۔ ہم تو خوش ہیں اگر وہ خوش ہے!

اماں کی آواز میں جا بجا ٹھنڈی سانسیں تھیں اور انہیں اپنی آواز اجنبی محسوس ہو رہی تھی۔

دوپہر کے وقت جب مظہر اور لڑکے پول میں چھلانگیں مارتے' تو بیلی ایپرن باندھے ان کے لیے کبھی ڈرنکس' کبھی خشک تولیے اور کبھی سینکس لا کر انہیں دیتی رہتی۔ پول کے اردگرد کرسیاں اور میز پڑے رہتے تھے۔ جن پر بیٹھ کر اماں ابا یہ نظارہ دیکھ کر وقت گزارا کرتے۔

انہیں امریکہ آئے ہوئے اب دو ہفتے گزر چکے تھے۔ اس دوران مظہر سے کرنے والی سب باتیں ان کے پاس ختم ہو گئی تھیں۔ حیرت کی بات تھی' ورنہ وہ تو سوچتے تھے کہ اتنے بہت سے سالوں کی باتیں کرتے انہیں کچھ سال تو لگ ہی جائیں گے۔ سب رشتہ داروں کا سرسری طور پر حال وہ بھی پوچھ ہی چکا تھا۔ زمینوں کا موضوع بھی کلر زدہ اور بوسیدہ ہو چکا تھا۔

فورتھ آف جولائی کا لانگ ویک اینڈ آ رہا تھا۔ امریکنوں کو تین دن لمبے ویک اینڈ کی ہمیشہ ہی بہت خوشی ہوتی ہے۔ اس لیے وہ اس چھٹی کو بھرپور طریقے سے منانے کے لیے کوئی نہ کوئی سیر و تفریح کا پروگرام' کوئی گیٹ ٹو گیدر ضرور رکھتے ہیں۔

مظہر اور سیلی نے بھی اس بار فورتھ آف جولائی کے یوم آزادی کے ویک اینڈ پر ایک بہت بڑی پول پارٹی کا انتظام کیا تھا۔ پول کے ارد گرد کرسیاں بچھا دی گئی تھیں اور ہاٹ ڈاگ اور برگرز کا باربی کیو ہو رہا تھا۔ مظہر اور سیلی نے اپنے کچھ امریکن دوستوں اور نواحی علاقوں میں رہنے والے پاکستانی ڈاکٹروں کی فیملیوں کو بھی مدعو کر رکھا تھا۔

تیز موسیقی کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی' مگر اس تیز شور میں بھی ابا اور اماں کو غسل خانے میں ظہر کی نماز کے لیے وضو کو جاتے ہوئے کچھ آوازیں سنائی دے گئیں۔ مظہر اور سیلی اپنے بیڈروم میں تھے۔ نہ جانے کیا مسئلہ تھا۔ مظہر کچھ ملتجیانہ سے انداز میں سیلی سے کہہ رہا تھا۔

ہنی میں سمجھتا ہوں! مگر پلیز تم بھی تو ذرا سمجھنے کی کوشش کرو۔ وہ ایک Conservative سوسائٹی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگر تمہیں مردوں کے ساتھ اور نہانے کے کاسٹیوم میں ملبوس دیکھ لیا تو نہ جانے کیا سوچیں گے! انہیں اچھا نہیں لگے گا!

حد ہوتی ہے مظہر! کتنے دنوں سے میں نے صرف اسی لیے سوئمنگ نہیں کی کہ سوئمنگ کے لباس میں مجھے دیکھ کر وہ اچھا نہیں محسوس کریں گے۔ آخر آج پول پارٹی ہے! اتنا گرم دن ہے! آج بھی میں سوئمنگ نہ کروں یہ تو میرے ساتھ بے انصافی ہے! آخر سوئمنگ سوٹ میں عریانی کہاں سے آ سکتی؟ تم لوگوں کے کلچر کو میں تو خیر بالکل نہیں سمجھ سکتی! سیلی غالباً منہ پھلا کر بیٹھ گئی تھی کیونکہ کچھ دیر کے لیے کوئی آواز نہیں آئی۔

تمہیں پتہ ہے کتنے تھوڑے سے گرم دن نصیب ہوتے ہیں ہمیں سوئمنگ کے لیے وہ بھی ہم چھوڑ دیں صرف اس لیے کہ انہیں میرا سوئمنگ کا لباس پہننا پسند نہیں ہوگا۔ میں تو اس منطق کو بالکل قبول نہیں کر سکتی۔ اگر ایسا ہی تھا تو انہیں سردیوں میں بلا لیا ہوتا۔ کم از کم ہماری بیوٹی فل سمر ویکیشن تو ضائع نہ کرتے یہاں آ کر! سارا سمر گزار کر جب وہ جائیں گے تو نہانے کے لیے وقت ہی کونسا بچے گا اور پھر اگلے سال تک کا انتظار کرنا ہوگا! اف میں تو گھٹ کر مر جاؤں گی اس طرح!

ابا ساری انگلش سمجھ رہے تھے مگر انہیں اماں کو ترجمہ کر کے بتانے کا حوصلہ نہیں ہو رہا تھا۔ مگر مجبوری تھی کچھ دیر بعد انہوں نے سب کچھ اماں کے گوش گزار کر دیا۔

اماں اور وہ دونوں مجرموں کی طرح شرمندہ سے اپنے کمرے میں بند سے ہو کر رہ گئے۔ انہیں تو خبر بھی نہیں تھی کہ وہ اتنے قصوروار تھے۔ مگر اب کیا کرتے۔ وہاں تو بیٹے رحم و کرم پر تھے اور کوئی جگہ ہوتی تو بھاگ کر تانگہ پکڑ لیتے اور اپنے گھر کی راہ لیتے مگر اس پہاڑ کی چوٹی تو ایک ایسے جزیرے پر واقع تھی جس کے چاروں طرف گہرا سمندر تھا اور اتر کر بھاگنے کی کوئی صورت ممکن نہیں تھی۔

ایک پاکستانی ڈاکٹر کی بیوی نصرت' اماں جی کو سلام کرنے اندر آ گئی اور خوب گھل مل کر باتیں کرنے لگی۔ اماں خوش ہو گئیں۔ کتنے عرصے بعد اپنی زبان میں کسی سے بات کرنے کا موقعہ ملا تھا۔

چلئے نا اماں جی! آپ کہاں اندر گھسے بیٹھے ہیں دونوں! باہر چل کر دیکھیں پول پارٹی کتنے زوروں سے چل رہی ہے۔ چلئے نا میں آپ کو برگر کھلاؤں۔ اتنا گرم دن ہے آج تو۔ ہم لوگ تو اتنے گرم دن کے لیے ترس کر رہ جاتے ہیں یہاں!

نصرت بڑی ہنس مکھ تھی۔ ضد کر کے اماں کو کھینچ کر باہر لے گئی اور اماں ابا لوگوں کی رونق دیکھ کر کچھ دیر کے لیے خوش ہو گئے۔

یار! بڑا خوش نصیب ہے تو! کاش میرے والدین بھی زندہ ہوتے تو میں بھی انہیں یہاں بلاتا! کتنا عرصہ رہیں گے یہ لوگ؟

نصرت کا شوہر ڈاکٹر علی کوک کی چسکیاں لگاتا مظہر سے گفتگو کرنے لگا۔ میری خوش نصیبی ہے کہ یہ لوگ یہاں آئے ہیں! یار کئی سالوں سے کہہ رہا تھا مگر اماں ابا مانتے ہی نہیں تھے! مظہر نے جواب دیا۔

چل یار اب تو انہیں چار چھ ماہ رکھ کر اپنی ساری حسرتیں پوری کر لے! مظہر کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔

نہیں یار! اتنا لمبا عرصہ تو یہ نہیں رہ سکتے یہاں! کیا کریں گے! بور ہو جائیں گے۔ بوڑھے لوگ اپنے ٹھکانے پر ہی ٹھیک ہوتے ہیں! یہ تو بس اگلے ہفتے جا رہے ہیں! سمر ویکیشن کا ٹائم ہے' پھر ہم لوگوں کے کچھ اپنے بھی پلانز ہیں!

مظہر نے اپنے بڑے بیٹے کو ایک اونچی چھلانگ مار کر ڈائیو کرتے دیکھ کر دل ہی دل میں ایک فخر سا محسوس کیا۔

کم آن ڈیڈی جوائن آس! اس کے دونوں بیٹے اسے پکارنے لگے۔

آئی ایم کمنگ! اس نے جلدی سے اپنی کمر کے گرد لپٹا تولیہ اتار پھینکا اور ڈائیونگ بورڈ سے اچھل کر ایک زبردست ڈائیو لگا کر نیلے نیلے خوبصورت سوئمنگ پول کی گود میں یوں سما گیا جس طرح بچپن میں وہ اپنی ماں کے خوشبودار پلو میں سما جایا کرتا تھا۔



لالی کی بیٹی

''شمی نے ناشتہ کرلیا؟''

میں نے شمی کی ماں اپنی بیوی لالی سے پوچھا۔

''نہیں۔صرف چائے کی پیالی پی ہے۔کہتی ہے بھوک نہیں!''

لالی نے افسردہ ہوکر ٹھنڈی سانس بھری۔

اچھا! کہہ کر میں نے اخبار پھر اپنے آگے کرلیا۔ یہ بات نہیں کہ مجھے اپنی بیٹی کے ناشتہ کرنے کے ذکر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی یا میں اس کے بارے میں فکرمند نہیں تھا' اخبار تو اس لیے میں نے آگے رکھ لیا تھا تاکہ لالی میرے دل کی اصلی کیفیت کو نہ جان سکے۔ میری آنکھوں میں چھپے اس طوفان کو نہ دیکھ سکے جو لالی یا شمی' کسی ایک کو بھی ذرہ برابر تکلیف پہنچ جانے کے خیال سے چھلک جانے کو بے قرار ہوجاتا تھا۔

دراصل مجھے لالی اور شمی دونوں سے بہت پیار ہے۔کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ کس سے زیادہ ہے تو فیصلہ نہیں کرپاتا۔ پہلے لالی سے تھا' پھر شمی جیسا خوبصورت کھلونا ہمیں مل گیا تو میرے ساتھ ساتھ اس کی ماں بھی اس کی دیوانی ہوگئی۔ہم دونوں میاں بیوی ہروقت پروانوں کی طرح اس کے آگے پیچھے پھرتے رہتے تھے۔

وہ میرے جگر کا ٹکڑا تھی۔ جی چاہتا تھا اس کے لیے آسمان سے تارے توڑ لاؤں زمین پر فرش بن کر بچھ جاؤں۔ ٹھنڈی پون کا جھونکا بن کر اسے میٹھی لوریاں سناؤں' اوڑھنی بن کر اسے یوں ڈھانپ دوں کہ زمانے کی سرد گرم ہوا اسے کبھی نہ چھو سکے وہ میری لاڈلی اور محبوبہ بیوی لالی کی بیٹی تھی۔ اس کے لیے میں کچھ بھی کرسکتا تھا۔

جس زمانے میں شمی میڈیکل کالج کی طالبہ تھی تو ہروقت اپنے کمرے میں گھس کر پڑھتی رہتی تھی۔ہم میاں بیوی اس کے آرام کا ہرممکن طریقے سے خیال رکھتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ وہ ڈسٹرب نہ ہو۔ ہمیں اس کے ڈاکٹر بن جانے کی بہت خوشی اور اس کی لیاقت پر بہت فخر تھا۔

وہ بہت ذہین' آرٹسٹک' اعلیٰ وارفع قسم کے خیالات کی مالک لڑکی تھی۔ اپنی تعلیم کے ساتھ ساتھ اس نے اپنی آرٹ نوازی کا سلسلہ بھی جاری رکھا ہوا تھا۔ خود بھی پینٹ کر لیتی تھی مگر زیادہ تر دوسروں کی پینٹنگز دیکھنے کا شوق رکھتی تھی۔

وہ بہت نازوں کی پلی تھی۔ ہلکی سی تکلیف پر چیخ اٹھتی۔ سردیوں میں اسے سردی بہت لگتی اور گرمیوں میں گرمی۔ سردیاں تو وہ پھر بھی شکایت کیے بغیر گزار لیتی مگر گرمی اس سے ہرگز برداشت نہ ہوتی۔

موسم بہار ابھی آدھا ہی گزر رہا ہوتا اور وہ گرمی! گرمی! چلانے لگتی۔ ہم دونوں اس کی اس عادت سے واقف تھے اس لیے ہمیں کوئی حیرت نہ ہوتی۔ لالی' اس کے لیے گرمیوں کے نت نئے لون وائل کے کپڑے بنوانے کے لیے درزیوں کی دکانوں کے چکر لگانا شروع کر دیتی اور میں موسم گرما کی آمد کے سلسلے میں گھر میں جو ضروری کام کروانے والے ہوتے' ان کی طرف متوجہ ہو جاتا۔

اس کی طالب علمی کے زمانے کا ہی واقعہ ہے۔ ایک بار اسی طرح اس نے اپریل کے شروع میں ہی گرمی' گرمی' کا شور مچا دیا۔

ابو! جلدی سے میرا ایئر کنڈیشنر سروس کروائیں مجھے بہت گرمی لگتی ہے' مجھ سے پڑھا نہیں جاتا۔

وہ میرے پیچھے پڑ گئی۔

بیٹا ابھی تو موسم اتنا گرم نہیں ہوا' بارشیں بھی ہو رہی ہیں۔ ذرا ایک ہفتہ اور صبر کر لو۔ میرا تو خیال ہے' ابھی اے سی سروس کرنے والوں نے یہ کام شروع بھی نہیں کیا ہوگا۔

میں نے ٹال مٹول کی کیونکہ حقیقت کچھ یوں تھی کہ مجھے چند روز کے لیے شہر سے باہر جانا تھا۔ میں سوچ رہا تھا جلدی میں کیا کروانا' آ کر آرام سے کروا دوں گا۔ مگر شمی کی بسورتی شکل دیکھنے کی مجھ میں تاب نہ تھی۔ اے سی سروس کروانے کے بعد میرا اگلا کام اس کے کمرے کے باہر کی چھتوں کی مرمت کروانا' اور کمرے کا ہر سوراخ' ہر درز بند کروانا تھا۔ کیونکہ شمی کو چھپکلیوں سے بہت ڈر لگتا تھا اور میں ہر طور سے ان کی آمد کو روکنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ ہر سال گرمیوں کے موسم کے آغاز میں' میں انڈے کے چھلکے دھاگے میں باندھ کر اس کے کمرے کے درازوں اور دہلیزوں پر لٹکا دیا کرتا' کیونکہ میں نے سن رکھا کہ چھپکلیاں انڈے کے چھلکوں سے بھاگ جایا کرتی ہیں۔

میرا بس چلتا تو دنیا بھر کی چھپکلیوں اور کاکروچوں کو نیست و نابود کر کے رکھ دیتا کیونکہ اسے کاکروچوں سے بھی بہت چڑ تھی۔

شمی کو گرم لگتی تو وہ کالج سے واپس آ کر نڈھال ہو کر اے سی والے کمرے میں گر پڑتی۔ اس کے ننھے منے خوبصورت لب کسی پیاسی چڑیاں کی چونچ کی طرح ادھ کھلے رہ جاتے۔ وہ بے حال ہو جاتی۔

ایسے میں دل چاہتا اڑ کر جاؤں اور جنت کی ایک آدھ کھڑکی کا رخ چپکے سے کھول کر اپنی بیٹی کے کمرے کی طرف موڑ دوں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی تازہ ہوا سے ہمارا پیارا پھول شگفتہ اور تروتازہ رہے۔ گرم لو کا کوئی بھی تھپیڑا اسے چھو کر بھی نہ گزر سکے خزاں کی اداسیاں اس کے مقدر سے کوسوں دور رہیں زمستانی ظالم ہوا کا کوئی بھی جھونکا اسے منجمد کرنے کی جرات نہ کر سکے۔

ہماری بیٹی تھی ہی اتنی خاص۔ نرم و نازک بالکل گڑیا جیسی دکھتی تھی۔ دل اتنا خالص اور مزاج اتنا دھیما کہ اپنے تو اپنے غیروں کو بھی اپنا گرویدہ بنا لیتی تھی۔ اس کا بچپن تتلیوں کے تعاقب میں نہیں گزرا کیونکہ اس کے پیچھے تو ہم' یعنی لالی اور میں تتلیاں بن کر اڑتے رہے تھے۔

وہ گلاب کا پھول بنی' اپنی جگہ۔ پر کھلی' ہوا کے شریر جھونکوں کی سہیلی بنے ہماری توجہ اور محبت کے خزانے دونوں ہاتھ سے لوٹتی' مسکائے چلی جاتی تھی۔

جب ثمی کی ضد حد سے بڑھ گئی تو میں نے اگلے ہی دن دکان پر فون کر کے دو اے سی سروس کرنے والوں کو بلوا لیا اور اسے اپنی نگرانی میں اتروا لیا۔ دونوں جوان تھے اس لیے منوں وزنی اے سی انہوں نے منٹوں میں نیچے اتار کر رکھ دیا۔

مگر جیسے ہی وہ اپنا گرم ہوا مارنے والا بلوور لیے آگے بڑھے' ان کے بڑھتے ہوئے ہاتھ وہیں رک کر رہ گئے۔ عین کمپریسر اور اے سی کی باڈی کی بیرونی جالی کے بیچوں بیچ گھاس پھوس اور تنکے جمع تھے۔ غالباً کسی نادان چڑیا نے گھونسلہ بنانے کی احمقانہ کوشش کی تھی۔

ارے دھیان سے نکالو کہیں گھاس اے سی کے اندر نہ پھیل جائے! میں نے انہیں احتیاط کرنے کی تلقین کی۔

انہوں نے تنکے ہٹائے' تو گھاس پھوس میں چھپا ایک ننھا سا جاندار وجود اپنی حیرت زدہ آنکھوں سے ہمیں تکنے لگا۔ اپنے اوپر کی چھت کھسک جانے سے بے چین' خوفزدہ ہو کر منی منی سی چیخیں مارنے لگا۔

ہائے اللہ بے چارہ بچہ! لالی بھی اوپر آ کر اس نظارے کو دیکھنے میں مصروف ہو چکی تھی۔

اب اس بے چارے بچے کا کیا ہو گا۔ ننھے سے گوشت کے لوتھڑے کے ننگ دھڑنگ' لاوارث وجود نے ایک لمحے کے لیے سب کو اس کے مستقبل کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا۔

ہائے کاش اس گھونسلے کو نہ ہی ہٹانا پڑتا۔ کتنا خوبصورت گھر بنایا ہو گا اس بچے کے ماں باپ نے اس کے لیے۔ کاش یہ تھوڑا سا بڑا ہی ہو گیا ہوتا تاکہ اڑ کر کہیں جا تو سکتا۔ یوں محتاج اور کمزور تو نہ ہوتا۔ پورے بی!

لالی کی آنکھوں نے پیغام دیا۔

لیکن ہم اس کے بڑے ہونے کے انتظار میں اے سی سروس کروانے کے بغیر تو نہیں رہ سکتے تھے۔ آخر ہماری شمی کو گرمی لگتی ہے۔ اسے کیسے تکلیف میں رکھ سکتے تھے ہم۔

میری نظروں نے لالی کو جواب دیا۔ ہم دونوں کی آنکھوں میں کچھ مجبوری کچھ تاسف اور کچھ ڈھٹائی سی تھی۔

صاحب جی! لائیں اسے کسی اونچے درخت پر رکھ دوں!

مالی کے بارہ سالہ بیٹے فیکے نے پیش کش کی۔ وہ بھی کافی دیر سے پاس کھڑا تماشا دیکھ رہا تھا۔

ہاں! یہ ٹھیک ہے۔ یار کسی اونچی ہی جگہ رکھنا۔ تمہیں تو پتہ ہے محلے میں وہ سفید بلا رہتا ہے۔ کہیں وہ کھا ہی نہ جائے۔

میں نے مسئلے کا حل نکلتے دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا۔

وہ ذلیل' منحوس بلا! مجھے تو بہت زہر لگتا ہے۔ نہ جانے کہاں سے آجاتا ہے۔ رات کو کوڑے کے ڈبے کھنگالتا' خوفناک آوازیں نکالتا اور دوسری بلیوں سے لڑتا ہے۔ بہت شور کرتا ہے!''

لالی نے فوراً بلے سے نفرت کا اظہار کیا۔

یہ لے فیکے! جا اسے کسی اونچے درخت پر رکھ آ! میں نے اسے دو روپے کا نوٹ اور گھونسلے میں ملتے چڑیا کے بچے کو تھماتے ہوئے کہا اور اپنے ضمیر کا بوجھ کسی حد تک ہلکا ہوتا ہوا محسوس کیا! شکر ہے اس چڑیا کے بچے کا معاملہ تو نپٹا۔

اے سی سروس کرنے والے اب سرف ملے پانی سے اے سی کو بہت اچھے طریقے سے دھو رہے تھے اور آپس میں گپ شپ بھی کر رہے تھے۔

نیچے لان میں کھلے خوبصورت پھول بہت خوش نما دکھائی دے رہے تھے۔ موسم بہار اپنی خوبصورتیاں ہر سو بکھیرے ہوئے تھا پچھواڑے میں بنے ملازموں کے کوارٹر کے اوپر چنبیلی کی بیل کسی ضدی' من مانی کرنے والی لڑکی کی طرح بس ہر طرف چڑھے چلی جا رہی تھی۔ منہ زور ہوتی دکھائی دیتی تھی۔

تھوڑی ہی دیر میں سروس کرنے والے اے سی کو دوبارہ فٹ کر کے اپنے پیسے لے کر چلے گئے۔ اے سی ٹھیک چل رہا تھا۔ ہم دونوں میاں بیوی ٹیرس پر بیٹھ کر باغ ک نظارہ کرنے اور شمی کی خواہش پوری ہو جانے کے خیال سے خوش ہونے لگے۔ ہم نے چائے بھی اوپر ہی منگوا لی اور خوشگوار ماحول کو انجوائے کرنے لگے۔

یکا یک نہ جانے کہاں سے ایک براؤن رنگ کی' پیلی چونچ والی لالی چڑیا کا جوڑا آ کر ہمارے سروں پر منڈلانے' اے سی کے گرد چکر لگانے اور شور مچانے لگا۔ ان کی دلدوز چیخیں ہمارے کان کے پردے پھاڑے دیتی تھیں۔

ذلیل انسانو! اپنی بیٹی کے ذرا سے آرام کی خاطر ہمارا ہنستا بستا گھر توڑ دیا۔ ہمیں بے گھر کر دیا۔

لالی چڑیا چیخے جا رہی تھی۔

لاڈلی بیٹی کے باپ' میری معصوم بیٹی کہاں ہے؟ جواب دے ورنہ میں چونچیں اور ٹھونگے مار مار کر تیرا سر پھاڑ دوں گا۔

چڑا' پھڑ پھڑاتا ہوا' بالکل میرے سر کی جانب نشانہ بنا دھ کر غوطے کھانے لگا۔

ہاں! ہاں! میری بیٹی کہاں ہے؟ لالی بے قرار ہو کر اے سی کے گرد گول گول چکر لگانے لگی۔

میں اور میری بیوی نے شرمندہ ہو کر نظریں نیچی کر لیں خفت کے مارے چائے کی پیالیوں میں ہی ڈوب مرنے کو جی چاہنے لگا۔

ہم واقعی ان کی نوزائیدہ بچی کی بدنصیبی کے ذمہ دار تھے۔

لیکن ہم نے لالی کی بیٹی کو کہیں کوڑے کرکٹ میں تو نہیں پھنکوا دیا آخر! ہم نے تو اسے نہایت احتیاط سے کسی اونچے درخت پر' یعنی ایک محفوظ مقام پر رکھوا دیا ہے۔ اس کے علاوہ ہم اور کر بھی کیا سکتے تھے۔ اگر یہ چڑیا چڑا چاہیں تو تھوڑی سی تلاش کے بعد اپنی بیٹی کو ڈھونڈ سکتے ہیں۔

ہم دونوں کی خاموش نگاہوں' بند زبانوں' احساس جرم سے بھرپور دلوں نے ایک دوسرے کو تسلی دی۔

یکا یک میری نظر اپنے پچھواڑے کے سرونٹ کوارٹر کی چھت پر جا لگی۔ ضدی لڑکی جیسی خود سر' چنبیلی کی بیل پر ننھے ننھے خوبصورت خوشبودار سفید پھول ستاروں کی طرح ٹکے ہوئے چمک رہے تھے۔

سرسبز' توانا' پتوں کے زیور سے آراستہ' ٹہنیوں کے جال پر جھولتا' پنجوں سے اپنا راستہ بناتا' خراماں خراماں چلتا' کسی بات کی پروا نہ کرتا ہوا' وہی موٹا تازہ سفید بلا' اپنے نتھنے چاٹتا' شاہانہ انداز سے نیچے اتر رہا تھا۔

اوہ! مائی گاڈ! لالی کے منہ سے نکلا۔

بلے کے ہونٹوں کے اردگرد کا علاقہ سرخ ہو رہا تھا اور اس کی تھوتھنی چمک رہی تھی۔ بلے کے انداز میں اتنی اطمانیت تھی کہ یہ جاننا ہرگز مشکل نہ تھا کہ وہ کہاں سے اور کیا کر کے آ رہا ہے۔

یہ ذلیل فیکا بھی بڑا کمینہ نکلا۔ دو روپے لینے کے باوجود کام صحیح نہیں کیا اور ٹرخا کر چلتا بنا۔

مجھے فیکے پر بے انتہا غصہ آنے لگا۔

چچ چچ' بے چارہ بچہ! لالی افسوس کے دو لفظ کہہ کر چائے کے برتن سمیٹنے لگی۔

میں نے ڈرتے ڈرتے لالی چڑیا اور چڑے کی تلاش میں ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں۔ وہ دونوں بے چین پریشان روحیں نہ جانے کہاں اپنی بیٹی کی تلاش میں جا چکی تھیں۔ اب ان دونوں کا وہاں نام و نشان بھی نہ تھا۔ میں نے شکر کیا کہ ماں نے بچی کا یہ انجام نہ دیکھ لیا ورنہ اس کا تو زندگی پر سے اعتبار ہی اٹھ جاتا۔

سوری لالی! میں تمہاری بیٹی کو نہ بچا سکا۔ میرے منہ سے بے ساختہ۔ یہ الفاظ نکل گئے اور میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

لالی! شمی کو زبردستی ناشتہ کروا دو نا! میرے اپنے حلق میں ٹوسٹ خشک ہو کر پھنسنے لگا تھا۔

آپ کو تو پتہ ہے اپنی مرضی کرتی ہے۔ بچوں کو البتہ کھلا دیا ہے۔ خود ویلیم لے کر کمرے میں سونے کے لیے جا چکی ہے۔

لالی نے بے بسی سے جواب دیا۔

نانا ابو نانا ابو! جلدی آئیں میں نے کسی کی ڈور پکڑی ہے۔

شمی کے آٹھ سالہ بیٹے بلو نے لان میں سے آوازیں دینا شروع کر دیں۔

او ہو! بیٹا! صبح ہی صبح تم کو گڈی ڈور کی پڑ جاتی ہے! چلو اندر آؤ آ کر کارٹون لگا لو! آرام سے بیٹھو اندر! لالی نے حسب معمول بلو کو گڈی بازی سے دور رکھنے کی کوشش کی اور بلو نے حسب معمول اپنی نانی کی ایک نہ سنی۔ وہ پتنگ بازی کا' جنون کی حد تک شوق رکھتا تھا اور اس معاملے میں کسی نصیحت کا اس پر کبھی کوئی عمل نہیں ہوتا تھا۔

اسے یہ شوق اپنے باپ سے ورثے میں ملا تھا۔ اور دونوں باپ بیٹا اسے بہت انجوائے کرتے تھے شمی اب ایک علیحدہ ہی دنیا کی باسی تھی۔ وہ پہلے والی شمی نہیں رہی تھی۔ جب سے اس کی شادی ہوئی تھی۔ وہ ایک مختلف سی لڑکی بن کر رہ گئی تھی۔

یہ نہیں کہ اس کا شوہر اچھا نہیں تھا یا اسے اچھا رکھتا نہیں تھا ایسی بات ہرگز نہیں تھی لیکن پھر بھی شمی جیسے کہیں کھو کر رہ گئی تھی۔ اس کا شوہر فوج میں ایک لائق کرنا مانا جاتا تھا۔ ساس سسر اچھے اور دیور نندیں پیار کرنے والی تھیں۔ زمیندار لوگ تھے اس لیے پیسے کی کمی بھی نہیں تھی۔ دنیاوی آسائش کی ہر چیز ان کی زندگی میں موجود تھی لیکن پھر بھی شمی آسودہ نہیں تھی۔

دراصل شادی کے بعد سے اس کے شوہر اکرم نے اسے ڈاکٹری کی پریکٹس کی اجازت نہیں دی تھی۔ وہ اسے ایک مکمل مشرقی روایتی بیوی کے روپ میں دیکھنا چاہتا تھا' جو کہ وہ بن بن کر دکھا رہی تھی مگر ڈاکٹری نہ کر سکنے کی وجہ سے وہ خود کو شیشے کی بند بوتل میں

قید رنگین' محبوس تتلی سمجھنے لگ گئی تھی۔

اسے اپنے شوہر' بچوں اور گھر سے دیوانگی کی حد تک پیار تھا مگر اس کی ذات کا ایک حصہ حسرت تعمیر کی آرزو میں ویرانیوں اور اداسیاں کا ڈیرہ بن کر رہ گیا تھا۔

میں نے اور لالی نے بھی کئی بار اکرم کو آرام سے سمجھایا کچھ دلائل دیئے' منوانے کی کوشش کی لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ کہتا تھا شادی گھر بسانے کے لیے کی ہے' گھر برباد کرنے کے لیے نہیں اور بیوی گھر سے باہر ہوگی تو گھر پر برا اثر پڑے گا۔

لیکن تمہیں پتہ تھا کہ تم ڈاکٹر سے شادی کر رہے ہو۔ شمی احتجاج کرتی۔

تو کیا ہوا! میں کسی انجینئر سے بھی تو شادی کر سکتا تھا اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ اسے ڈیم بنانے کے لیے بھیج دوں۔ وہ جواب دیتا شادی کے وقت تو اچھا بھلا' بھلا چنگا دکھائی دیتا تھا' لیکن شادی ہوتے ہی بیماری نے اسے آن لیا۔

اسے احساس کمتری کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا۔ وہ کسی صورت بھی یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ اس کی بیوی اس سے کسی صورت بھی بہتر ثابت ہو یا مختلف ہونے کی جسارت کر سکے۔

اس کے نزدیک بیوی میں ذہانت' لیاقت' قابلیت اور احساس خود اعتمادی' کوئی اعلیٰ جوہر نہیں' بلکہ شخصیت کو کھوکھلا کر ڈالنے والے' سرسراتے کیڑے ہوتے ہیں' جو بالآخر کوئی نہ کوئی گل کھلا کر ہی چھوڑتے ہیں۔

اچھا خاصہ پیار محبت' سلوک ہونے کے باوجود شخصیتوں کے اتنے بڑے تضاد کی وجہ سے اکثر میاں بیوی میں ان بن ہو جاتی۔ شمی روٹھ کر روایتی انداز میں میکے نہ آتی بلکہ ہسپتال میں والنٹری طور پر مختلف وارڈوں میں کچھ گھنٹے گزارنے' یا مریضوں کی دیکھ بھال کرنے کے لیے اپنی دوست ڈاکٹر شگفتہ سعید کے پاس جا پہنچتی۔ شگفتہ اور وہ دونوں پیاری سہیلیاں اور پرانی کلاس فیلوز تھیں۔ ایک دوسرے کو سمجھتی تھیں اور ایک دوسرے کا دکھ درد بانٹ لیا کرتی تھیں۔

اب کی بار نہ جانے کیا بات ہوئی تھی کہ شمی شگفتہ کے بجائے ہماری طرف چلی آئی تھی۔ میرا تو اس کو دیکھتے ہی ماتھا ٹھنکا تھا کیونکہ اب کی بار دونوں بچے بھی ساتھ تھے۔ ورنہ عام طور پر بلو اور نیلو اپنے گھر ہی رہتے تھے۔

شام ڈھلے شمی سو کر اٹھی۔ میں اور لالی سوچ میں پڑے ہوئے تھے کہ کیا کریں۔ بچوں کو تو لالی نے سارا دن سنبھال لیا تھا لیکن بچوں کی ماں کے بارے میں کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ کیا کریں۔

امی! ابو! کھانا کھانے باہر چلتے ہیں! شمی نے پرانے دنوں کی طرح ہم دونوں کے گلے میں بانہیں ڈال کر فرمائش کر دی ہم

دونوں اسے بہتر موڈ میں دیکھ کر پھولے نہ سمائے ورنہ ہم تو ڈرے بیٹھے تھے کہ نہ جانے کونسا طوفان آنے والا ہے۔

چائنیز کھانا کھانے' اور لبرٹی میں کچھ دیر گھومنے کے بعد ہم میاں بیوی' شمی اور اس کے دونوں بچے خوب خوش وخرم گھر کو لوٹے۔

بچوں کو سلا دینے کے بعد لالی میں اور شمی حسب معمول گھر کے آگے چہل قدمی کرنے لگے۔شمی خلاف توقع بہت خوش نظر آ رہی تھی آخر میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا کہ اس کی خوشی کی وجہ کیا تھا۔

ابو! دراصل میں نے آپ کو ایک خوشخبری سنانا تھی! وہ مسکرائی۔ وہی من موہ لینے والی مسکراہٹ جس پہ میں لٹ جایا کرتا تھا۔

کیا بیٹا؟ لالی اور میں ہمہ تن گوش ہو گئے۔

ابو میں نے ای این ٹی ڈپلوما کورس میں داخلہ لے لیا ہے۔

کیا؟ کب؟ کیسے؟ ہمیں پتہ تھا کہ ایم بی بی ایس کے بعد سے شمی کو ہمیشہ سے ہی ای این ٹی میں سپیشلائز کرنے کا جنون تھا جو شادی کے بعد اس نے کسی ڈبے میں بند کر کے کسی اونچے سے طاق پر رکھ چھوڑا تھا۔

ابو! پروفیسر رشید کہتے ہیں میں انشاءاللہ بہت اچھی سپیشلسٹ ثابت ہوں گی۔ بہت حوصلہ افزائی کی ہے میری انہوں نے ابو!

لیکن؟

کلاسز تو اگلے ماہ سے شروع ہوں گی لیکن میں نے داخلہ تو لے ہی لیا ہے۔ وہ خوشی سے تقریباً ناچ اٹھی۔

اچھا! اکرم مان گیا؟ لالی نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

شمی چپ ہو کر خلاء میں گھورنے لگی۔

وہ مانے یا نہ مانے! میں نے جب فیصلہ کر لیا ہے تو بس ٹھیک ہے میری مرضی!

وہ خودسری سے بولی۔

ہوں! لالی اور میں ہنکارا بھر کر رہ گئے۔

وہ ہم دونوں کی خاموشی میں چھپا خوف اور آنے والے طوفان کا خدشہ محسوس کر کے گھاس پر ہی بیٹھ گئی۔

بیٹا! اس سے پوچھ لیتیں تو... لالی نے دھیرے سے کہا۔

امی! آپ کو تو پتہ ہے' اکرم کبھی نہیں مانیں گے۔ آخر میری بھی تو کوئی زندگی ہے۔ میری بھی تو کوئی خواہش ایسی ہو سکتی ہے جو اس کی خواہش سے علیحدہ ہو۔ کم از کم آپ لوگ تو سمجھیں! مجھے سپورٹ کریں میرے اس فیصلے میں۔

بیٹا وہ تمہارا شوہر ہے' پھر تم کو دل وجان سے پیار کرتا ہے تمہاری اس کے علاوہ ہر خوشی پوری کرتا ہے۔ اس کا تعاون حاصل ہوتا تو تم جو جی چاہتا کر لیتیں مگر اس طرح۔

ابھی میری بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ شمی بلک بلک کر رونے لگی۔

ابو! آپ لوگ بھی مجھے نہیں سمجھتے! مجھے نہیں جانتے! بلکہ میرے واقف ہی نہیں بننا چاہتے۔

آپ کو کیا پتہ وہ مجھ سے کس قسم کا پیار کرتا ہے۔ وہ مجھ سے پیار ضرور کرتا ہے مگر اپنی ٹرمز پر۔

میری پوری ہستی کو پسند نہیں کرتا بلکہ صرف میرے اپنی بیوی ہونے' اپنی ملکیت ہونے کے احساس سے محبت کرتا ہے۔ میں صرف اس کے گھر' کچن اور بستر کے قابل ہوں' اور کسی قابل نہیں۔ میں کسی قسم کا کوئی فیصلہ کبھی نہیں کر سکتی۔ اپنی مرضی سے کہیں آ جا نہیں سکتی' اپنے ساتھی ڈاکٹروں سے نہیں مل سکتی۔ صرف اس لیے کہ میں عورت ہوں یعنی کم تر ہوں۔ ایک مکمل باشعور انسان نہیں ہوں۔

ابو! کچن اور بستر میں پڑا پڑا میرا وجود گل سڑ گیا ہے اس میں سے بساند آنے لگی ہے۔ مجھے اپنے آپ کو بچانا ہے۔ اپنی مدد آپ کرنا ہے! ہیلپ می پلیز! ہیلپ می۔

لالی کا ننگ دھڑنگ ننھا سا بچہ اپنی پیلی چونچ کھولے کسمسا رہا تھا اس کی کھلی آنکھیں بے بسی کا فسانہ سنا رہی تھیں۔ وہ چیں چیں کرتا چیخ رہا تھا۔

مجھے پناہ چاہئے' مجھے پناہ چاہئے! پناہ چاہئے! میری مدد کرو! میں نے لالی کی بیٹی کی طرف حیران ہو کر دیکھا۔

وہ اب ایک عورت ایک ماں تھی دس سال کی محنت طلب شادی کے کٹھن مراحل سے گزرنے کی تھکن اور اپنے آپ کو مستقلاً کھڑا رکھنے کا عزم اس کے چہرے سے پوری طرح عیاں تھا۔

اگلی صبح اکرم بھی آ گیا ناشتے کی میز پر بیٹھا مجھ سے کہنے لگا۔

آنٹی! انکل! اسے کہیں سیدھی سیدھی گھر چلے! تماشے کرنا بند کرے۔ بھلا یہ بھی کوئی عمر ہے طالب علمی کی! بس پڑھ لیا جو پڑھنا تھا مجھے زچ نہ کرے!

شمی اپنے آنسو پی جانے کی کوشش میں اپنا ہونٹ کاٹے چلی جا رہی تھی ہم دونوں میاں بیوی بے بس ہو کر ان دونوں کو ناشتہ کرنے کے لیے چائے' ٹوسٹ' جیم وغیرہ پیش کرتے چلے جا رہے تھے۔

بیٹا تم دونوں نرمی اور انڈر سٹینڈنگ سے کوئی سمجھوتہ کرلو!

دیکھو ضد میں نہ آؤ لالی خوشامدی لہجے میں داماد سے کہنے لگی۔

سامان پکڑو اور چلو گھر! بس بہت ہوگئی! وہ ٹشو پیپر سے منہ صاف کرنے لگا۔

نہیں! شمی بھی اس روز کچھ زیادہ ہی غصے میں آ گئی تھی میں کہتا ہوں چلتی ہوں یا پھر کسی اور طرح سے ساری اکڑ فوں نکال دوں! یہ آج کل کی عورتیں نہ جانے اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہیں! یہ سب ماڈرن لبریٹڈ عورتوں کے چونچلے ہیں! اپنے عورت پن سے فرار حاصل کرنے کے طریقے ڈھونڈتی پھرتی ہیں۔

وہ تحقیر سے بولا۔

لیکن میری ذات کی تسکین اسی طرح ہوتی ہے اکرم! اب کے شمی بھی چیخ اٹھی۔

چلو چلو! یہ ذات کی تسکین کا غم ناک فسانہ کسی اور کو جا کے سنانا۔ میں ان فضول مغربی نظریات کا ہرگز حامی نہیں بن سکتا۔ آخر ضرورت کیا ہے ڈاکٹری کرنے کی؟ کیا میں اپنے بال بچوں کو پال نہیں سکتا؟ کیا کمی رکھی ہے میں نے؟ پوچھیں! پوچھیں اس سے انکل؟ کسی چیز کی تکلیف دی ہے میں نے اسے؟

وہ میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

ارے میں نے کونسا اسے برقعہ اوڑھنے کو کہہ دیا ہے یا برتن مانجھنے پر مجبور کر رہا ہوں۔ آرام سے عزت دار بیوی بن کر گھر میں رہو۔ میں کچھ زیادہ تو نہیں مانگ رہا۔ وہ مانگ رہا ہوں جو میرا حق ہے! کیا یہ اتنا بھی نہیں کرسکتی میرے لیے۔ میں کوئی شرابی ہوں جواری ہوں؟ غیر عورتوں کے پاس جاتا ہوں؟ کیا غلط کرتا ہوں جس کی وجہ سے یہ مجھے خوش نہیں رکھ سکتی۔

وہ کھرے الفاظ میں اپنی صفائی پیش کر رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا۔ ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے یہ۔

ابو! میری روح لہولہان ہو چکی ہے اس گھر میں میری ذات کی ہر دم نفی ہوتی رہتی ہے۔ میری شخصیت کو پل پل کچلا جاتا ہے۔ میرے خیالات اور خواہشات کو غیر اہم اور بے معنی سمجھا جاتا ہے۔

میں تو جیسے Exist ہی نہیں کرتی۔ میرا سانس گھٹتا ہے ابو! میرے ٹکڑے ٹکڑے ہوتے رہتے ہیں! میں کیا کروں ابو میں کیا کروں؟

شمی بھی چیخنے لگی اور میں سوچنے لگا غلط یہ بھی نہیں کہہ رہی۔ ٹھیک ہے شمشاد بیگم! تم پڑھائیاں لکھائیاں کرو اپنی ذات کی تسکین

ڈھونڈو۔مگر یاد رکھو اس کے لیے تمہیں میرا گھر چھوڑنا ہوگا' یہیں رہو! میں اور میرے بچے اکیلے جی لیں گے! لڑائی جھگڑا کافی سنجیدہ رخ اختیار کر گیا تھا۔

بچے! ثمی کا رنگ زرد پڑ گیا۔

بچے تو میرے ساتھ رہیں گے! اب کے ثمی کی آواز میں کچھ ڈھیلا پن اور کمزوری سی تھی۔

جی نہیں! ماں کو کالج اور پڑھائی سے فرصت نہیں ہوگی تو بچوں کا خاک خیال رکھے گی! میں اپنے بچے رلنے کے لیے نہیں چھوڑ سکتا! میں ان کا خیال اچھی طرح رکھ سکتا ہوں!

وہ فیصلہ کن آواز میں بولا اور بلو اور نیلو کو ساتھ لے جانے کے لیے آوازیں دینے لگا۔

میرے اور لالی کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ یا اللہ یہ کیا ہونے جا رہا ہے اگر کوئی اونچ نیچ ہوگئی تو ثمی کا کیا ہوگا؟ بغیر بچوں کے وہ بھلا کس طرح رہ سکے گی؟ وہ تو ثمی کا کیا ہوگا؟ بغیر بچوں کے وہ بھلا کس طرح رہ سکے گی؟ وہ تو دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر جان دیدے گی۔ اکرم بھی اپنی ضد کا پکا ہے۔ وہ کبھی ثمی کو منانے کے لیے نہیں آئے گا۔ بچے ماں کے بغیر کس طرح رہیں گے؟ کیا ہوگا؟

راکٹ اور میزائل میرے سر کے آس پاس سے شوں شوں' زوں زوں کر کے گزر رہے تھے۔

لالی اور اس کا ساتھی چڑا چیں چیں کر کے شور محشر برپا کر چکے تھے۔ ان کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ ساری دنیا کو آگ لگا دیں بھسم کر ڈالیں۔ ٹھونگے مار مار کر سفید بلے کا بھیجا اڑا دیں۔

ادھر آؤ ثمی! میں نے اسے رعب سے بلایا۔

ثمی نے حیران سا ہو کر مجھے دیکھا اور دیکھتی رہ گئی۔ اس کا باپ اس وقت ایک منصف کا رول ادا کرنے جا رہا تھا۔

میرے پاس بیٹھو اور تحمل سے میری بات سنو' معاملے پر غور کرو۔

اکرم بیٹا! آپ بھی ادھر آئیں۔

میری زبان سے ملائمت اور شیرینی ٹپکنے لگی۔ دودھ کا دریا ٹھاٹھیں مارنے لگا۔

سفید رنگ کا موٹا تازہ' پلا پلایا' خونخوار بلا' مونچھوں پر تاؤ دیتا' رال ٹپکاتا' تکبرانہ انداز میں خراماں خراماں چلتا ہوا میرے پہلو میں آن کھڑا ہوا۔

ابو! ابو! ابو! آ گئے! دونوں بچے آ کر باپ کی ٹانگوں سے لپٹ گئے۔ اس نے دونوں کو گود میں اٹھایا' کاندھے پر چڑھایا اور

پیار سے ان کی گزشتہ روز کی گڈی بازی کی روداد سننے لگا۔ شمی منہ پھلائے کھڑی رہی مگر اس وقت وہ ایک دھندلے سے سائے جتنی بھی کسی کو نظر نہ آ رہی تھی وہ واقعی exist نہیں کر رہی تھی۔

امی چلیں گھر چلیں! ابو ہمیں لینے آئے ہیں!

یکدم بچوں کو وہ نظر آ گئی۔ شمی خاموش رہی۔ بچے اپنے کپڑے' سامان سمیٹنے کے لیے اندر کمروں کی طرف دوڑ گئے۔

میں نہیں جاؤں گی ابو!

میری بیٹی نے مجھ سے مخاطب ہو کر آہستہ سے کہا۔ اس کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔

مت جاؤ! تمہیں کہہ ہی کون رہا ہے! جواب ملا اور شمی رونے لگی۔

سفید' طاقتور ظالم بلا گاڑی میں سامان رکھوانے کے بعد اگلی سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔

اسے میری ہیرا جیسی بیٹی کی یوں ناقدری کرتے دیکھ کر میرا خون کھول رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا اسے ایک تھپڑ جڑ دوں مگر مجبور تھا۔

لالی چڑیاں اور چڑا بے بسی سے پھڑ پھڑاتے اور چیں چیں کرتے جا رہے تھے۔ وہ کچھ بھی تو نہ کر سکتے تھے۔

گھنے جنگل کے بادشاہ' بڑے بلے کا دستور ہے کہ جب وہ شکار کرتا ہے تو ایک ہی بار میں سارا ہڑپ نہیں کر جاتا۔ تھوڑا سا کھاتا ہے پھر باقی کا' پتوں میں ڈھانپ کر رکھ جاتا ہے۔ جب تک گوشت بچا رہتا ہے آہستہ آہستہ اسے کھاتا رہتا ہے کھاتا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ ختم ہو جاتا ہے۔

چلو بیٹے اپنے شوہر کے ساتھ اپنے گھر جاؤ! چلو شاباش!

میں نے شمی کو سینے سے لگا کر پیار کرتے کہا اور اپنے ساتھ لے کر باہر گاڑی کی طرف چل پڑا۔

شمی کی زبان نے چپ سادھ لی مگر نگاہیں مسلسل احتجاج کرتی چلی گئیں۔

ابو جی! آپ مجھے اس کے ساتھ بھیج رہے ہیں جو کبھی نہیں بدلے گا۔ اس کے خیالات کبھی نہیں بدلیں گے۔ یہ تمام عمر میری ہڈیاں چچوڑتا رہے گا خون چوستا رہے گا اور جسم کو ڈستا رہے گا۔ اور میں کچھ بھی نہ کر پاؤں گی۔ اپنی خواہشات پر کبھی عمل نہ کر پاؤں گی۔ میں اندر سے ٹوٹ پھوٹ جاؤں گی! آپ کو پتہ ہے نا ابو؟

میری خاموش نگاہوں سے اسے اسی ویولینگتھ Wavelength پہ جواب دیا۔

ہاں بیٹی! اس عمل کو یونہی' اسی طور' صدیوں تک جاری رہنا ہوتا ہے۔ یہی دنیا کا دستور اور آپ کا متوقع کردار اور عمل ہوتا ہے

کیونکہ آپ عورت میں اور اس میں کوئی کچھ نہیں کرسکتا! شمی ' گاڑی میں جا کر اگلی سیٹ پر خاموشی سے بیٹھ گئی۔

ایک بار پھر میں لالی کی بیٹی کو بلے سے نہ بچا سکا تھا۔ بلکہ اب کی بار تو میں نے اسے خود بلے کے حوالے کر دیا تھا۔



چارہ گر

جارج! جارج! پلیز ڈونٹ لیٹ می فال ڈاؤن! پلیز ڈونٹ لیٹ می فال ڈاؤن!

ڈاکٹر اسلم نے کاریڈور میں سے گزرتے ہوئے بوڑھی ورجینا کے کمرے میں پل بھر کو جھانک کر دیکھا۔ ورجینا حسب معمول چلا رہی تھی' التجائیں کر رہی تھی۔ اس کا گوشت کے پہاڑ جیسا فربہ جسم سٹریپوں سے بندھا ہوا تھا مگر پھر بھی اس نے اپنے دونوں ہاتھ مضبوطی سے بیڈ کی ریلنگ پر جما رکھے تھے۔

ڈاکٹر! ڈاکٹر! پلیز ہیلپ می! وہ ڈاکٹر اسلم چوہان کو اندر جھانکتے دیکھ کر چلائی اور اپنے جسم کو یوں سمیٹنے لگی جس طرح وہ واقعی کسی اونچائی سے گر رہی ہو۔

اسلم جانتا تھا کہ وہ اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ وہ نو برسوں سے یہی فقرہ دہراتی رہتی تھی۔ اس میں اتنا فکرمند ہونے کی تو بات نہیں تھی مگر پھر بھی نہ جانے اس درد بھری پکار میں کیا مقناطیسیت تھی کہ وہ ہمیشہ دو لفظ تسلی وتشفی کے اسے کہہ کر ہی اس کے کمرے کے آگے سے گزرتا تھا۔

کئی بار اس کا جی چاہا کہ وہ ورجینا کے پاس دو گھڑی رک جائے بیٹھ کر اس سے پوچھے کہ جارج کون تھا اور کیوں اسے گرانا چاہتا تھا مگر آج کل کے مشینی دور میں کس کے پاس اتنی فرصت پڑی ہے کہ وہ کسی دوسرے کے پاس بیٹھ کر اس کے دکھڑے سنے یا اس کے ڈر خوف اور احساس عدم تحفظ کے بارے میں چھان بین کرتا پھرے۔

اسلم ورجینا کے کمرے میں مسکراتا ہوا داخل ہوا۔ وہ بدستور خوف سے لرز رہی تھی۔ ڈاکٹر اسلم نے ورجینا کے بوڑھے' کانپتے' جسم کو دھیرے سے چھوا۔ اس کے مہربان لمس نے خوفزدہ بوڑھی عورت کو پل بھر میں شانت کر دیا۔ وہ یوں پرسکون ہو گئی۔ جس طرح رات کے وقت بھوک سے بلبلاتا' شیرخوار بچہ ماں کی چھاتی سے سیر ہونے کے بعد سکھ چین کی وادی میں اتر جاتا ہے۔

کوڈ نائنٹی نائن! کوڈ نائنٹی نائن!

یکدم کاریڈورز میں لگے سپیکرز گلا پھاڑ پھاڑ کر چلانے لگے۔ بار بار اناؤنسمنٹ ہونے لگی۔

مریضہ گریس میکڈانلڈ کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ جتنے ڈاکٹر اس وقت نرسنگ ہوم کی بلڈنگ میں موجود ہیں۔ فوراً ایمرجنسی روم میں پہنچیں۔ مریضہ زندگی اور موت کی کشمکش میں گرفتار ہے!

اوہ مائی گاڈ! بے چاری گریس!

ڈاکٹر اسلم نے دل ہی دل میں سوچا اور تیزی سے لفٹ میں سوار ہونے کے لیے قدم بڑھانے شروع کر دیے۔

گریس میکڈانلڈ نرسنگ ہوم کی پرانی مکین تھی۔ پہلے پہل تو ٹھیک ٹھاک تھی مگر پچھلے دو سال سے کوما میں چلی گئی تھی۔ ہائی بلڈ پریشر کی وجہ سے سٹروک کیا ہوا اس کے دماغ نے ہوش و خرد کی دنیا سے ناطہ ہی توڑ لیا۔ اب اسے مصنوعی نظام تنفس کی مشینوں پر ڈال کر زندہ رکھا جا رہا تھا۔ ایسے میں یہ اس کا دوسرا ہارٹ اٹیک تھا۔

جسم بے جان تھا مگر جان تھی کہ نہ جانے کہاں اٹکی ہوئی تھی۔ کسی انمول سرے کی طرح اب بھی پوشیدہ تھی زندگی کی ساری نقدی خرچ ہو چکی تھی مگر وہ ہیرا جسم کے کسی کونے کھدرے میں پڑا اسی طرح لشک رہا تھا جس طرح ابھی نیا نکور ہو اور وقت، جس کا کچھ نہ بگاڑ سکا ہو۔

ڈاکٹر اسلم چوہان پچھلے پانچ سالوں سے ویسٹرن نیویارک کے اس چھوٹے سے شہر پائن ویلی کے اولڈ ہوم نرسنگ ہوم میں بحیثیت ماہر امراض دل تعینات تھا۔

پاکستان سے ہجرت کیے ہوئے اسے اب لگ بھگ بیس سال ہو چکے تھے۔ مگر دل ابھی تک کچھ کچھ پاکستانی ضرور تھا۔ پہلے کچھ سال تو امریکہ آ جانے کے دھماکے کو جذب کرنے میں ہی گزر گئے، پھر اگلے پانچ چھ سال قدم جم جانے کی خوشی میں بسر ہو گئے۔ مادی آسائشوں نے آکٹوپس کی لاتوں کی طرح اسے اپنے سحر میں جکڑ لیا اور وقت الاسٹک کی طرح کھنچتا ہی چلا گیا۔

بیوی بچے، بھی امریکہ میں ہر لحاظ سے ایٹ ہوم محسوس کرتے تھے۔ اور خوش تھے۔ اس لیے واپس جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

پائن ویلی سرسبز وادیوں اور اونچے اونچے شاہانہ پہاڑوں، طلسماتی دریاؤں والا ایک ایسا قصبہ تھا، جہاں زندگی، بڑے شہروں کی طرح دوڑتی نہیں بلکہ دم لے لے کر چلتی تھی۔ سکون اور امن جہاں کے بادشاہ تھے اور قدرتی نظاروں کی خوبصورتی جہاں کی رانی تھی۔

پائن ویلی کا نرسنگ ہوم بھی، دوسرے امریکن نرسنگ ہومز کی طرح بوڑھے بوڑھیوں کا ہاسٹل نما، اجتماعی گھر تھا۔ جہاں ہر قسم اور

عمر کے بوڑھے رہتے تھے۔

مغربی معاشرے میں چونکہ بوڑھوں کا اپنے بچوں کے ساتھ رہنے کا کوئی تصور ہی نہیں اور انہیں حکومت کی طرف سے معاشی کفالت کا آرام میسر ہو جاتا ہے اس لیے اکثر بوڑھے بوڑھیا' جب اپنا خیال خود رکھنے کے قابل نہ رہیں تو انہیں نرسنگ ہوم میں داخل کروا دیا جاتا ہے۔ جہاں ان کی روزمرہ زندگی کی ضروریات مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی طبی امداد اور صحت کی نگہداشت کے لیے بھی عملہ موجود رہتا ہے۔

پائن ویلی کی نرسنگ ہوم صبح کا آغاز تقریباً سات بجے ہو جاتا۔ ناشتے کے لیے سب کو ڈائننگ روم میں لایا جاتا۔ کچھ مکین جو ابھی چاق و چوبند اور توانا تھے۔ خود ہی چل کر آجاتے' مگر کچھ ایسے جنہیں اتنا بھی احساس نہیں تھا کہ وہ زندہ ہیں یا مردہ' وہیل چیئرز پر مٹی کی بے جان' ڈھیروں کی مانند دھکیل کر لائے جاتے۔ ان کی گردنیں ادھر ادھر لڑھکتی اور کھلی بند آنکھیں شمعوں کی طرح کبھی جلتی بجھتی نظر آتیں۔ انہیں کچھ خبر نہ ہوتی کہ ان کے منہ سے کھانا باہر کو نکل رہا ہے یا اندر جا رہا ہے رال ٹپک رہی ہے یا کپڑے حاجات پر قابو نہ ہونے کی وجہ سے خراب ہو رہے ہیں۔ انہیں تو اتنا بھی شعور نہ تھا کہ ان کے لیے زندگی اب زحمت ہے اور موت رحمت ثابت ہو گی مگر رحمت آتی نہیں اور زحمت موجود رہتی تھی۔

کھانا کھلا دینے کے بعد نرسیں' کچھ والنٹیر خواتین جو خدمت خلق کے جذبے کے تحت اپنی خدمات مفت پیش کر دیا کرتی تھیں' تمام بوڑھوں کو نہلا دھلا' صاف کپڑے پہنا کر' سجا بنا کر بٹھا دیتیں ہفتے میں ایک بار بالوں کی کٹنگ اور سٹائلنگ بھی کی جاتی۔ پھر کچھ کو تو وہیل چیئر پہ ڈال کر صبح کی سیر پر لے جایا جاتا اگر موسم بہت شدید سرد ہوتا تو اندر گرم کمروں میں ٹی وی لاؤنج میں بٹھا دیا جاتا۔ کچھ ان ڈور کھیلوں کا بھی انتظام موجود تھا اس لیے کچھ بوڑھے بوڑھیاں' چیکرز' بنگو یا تاش سے جی بہلانے لگتے سب بوڑھے ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ مختلف شخصیات مختلف مزاجوں' مختلف خواہشوں سے مل کر بنے تھے لیکن ان سب میں ایک قدر مشترک تھی۔ وہ سب کے سب تنہائی کے شکار تھے' ان واقعلڈنیس کی اک لمبی آہنی زنجیر ان سب کے سینوں میں سے گزرتی' انہیں ایک لڑی میں پروئے' کھینچتی' جھٹکے دیتی چلتی چلی جا رہی تھی۔ سب کے گلوں میں ایک جیسا ہی آہنی طوق تھا' سبھی تہی دست' تہی دامن تھے۔ جھولی پھیلائے' کشکول سجائے' نہ آنے والوں کی راہ میں امید کے دیئے جلائے' توجہ اور محبت کے چند گنے چنے پھول چننے کی آرزو میں زندگی کے باقی ماندہ دن گزار رہے تھے۔

انہیں تو سانس بھی رک رک کر آتا تھا مگر جیئے چلے جا رہے تھے۔ بوڑھوں کو ملنے کے لیے آنے والے بیٹے' بیٹیوں' بہوؤں'

نواسوں اور دیگر رشتہ داروں کے پاس اب ٹائم نہیں ہوتا تھا۔ دراصل وہ بے فکر تھے۔ آخر انہیں اتنے اچھے انسٹی ٹیوشن میں رکھنے کا انتظام تو ان کے بچوں نے ہی کیا تھا نا۔ وہاں بھلا کس چیز کی کمی تھی۔ اچھا' صحت کے اصولوں کے عین مطابق' کھانا پینا' پھر عمدہ رہائش' تفریح' دل لگی کے سامان اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میڈیکل کیئر ہر وقت موجود جیسے ہی کسی کی طبیعت خراب ہوئی' اسی وقت' ڈاکٹر اور نرس نے انہیں سنبھال لیا۔ گھر پر تو ایسی سہولتیں ملنا مشکل ہو جاتا ہے پھر ہر کسی کو سکول کالج' یا نوکری پر جانا ہوتا ہے۔ بوڑھے فیملی ممبر کی نگہداشت کرنے کے لیے تو ایک باقاعدہ پورے وقت کا اٹینڈنٹ چاہیے ہوتا ہے کیونکہ ہر ایک کی اپنی اپنی زندگی ہوتی ہے اور اتنی چھوٹی' اتنی قیمتی' اتنی مصروف زندگی میں سے کوئی کسی بڈھے کے لیے زیادہ وقت نہیں نکال سکتا۔ کیونکہ آخر اس نے اپنی زندگی کے ساتھ بھی تو انصاف کرنا ہوتا ہے۔

ملاقاتیوں کے آنے کے وقت نرسنگ ہوم میں بہت چہل پہل ہوتی۔ سبھی بوڑھے اپنے رشتہ داروں کے آنے کی توقع رکھے اچھے کپڑے پہن' اپنے اپنے کمرے آراستہ کیے منتظر ہوتے ان کے شیلفوں پر ان کے بچھڑے ہوئے شوہر' بیوی' یا دور جا کر بس جانے والے بیٹے بیٹیوں کی تصویریں مسکرا رہی ہوتیں۔ ان کے دروازے ان کارڈوں سے سجے ہوتے جو ان کے بچوں نے انہیں کسی ہالی ڈے پر بھیجے ہوتے۔ کچھ جن کے ملاقاتی پابندی سے آتے تھے۔ ان کا درجہ دوسروں سے بلند تر سمجھا جاتا تھا۔ وہ بوڑھے بڑے تفاخرانہ انداز میں اپنے ملاقاتیوں کی ایک ایک بات کئی کئی بار دہراتے اور اپنی اہمیت کے نشے میں چور بے اختیار کھلکھلا' کھلکھلا کر ہنسنے لگتے۔ ایسے میں ان بوڑھوں کو بہت حسد محسوس ہوتا' جن کے ملاقاتی کبھی کبھار آتے تھے یا پھر کبھی نہیں آتے تھے۔ وہ ان کے آنے کی امید میں آہیں بھرتے رہتے اور اندر ہی اندر یوں تڑپنے لگتے جس طرح چودھویں کے چاند کی رات دریا کی دیوانی لہریں تڑپنے لگتی ہیں۔

ایسی ہی ایک بوڑھی میگی بھی تھی۔ اس کا اکلوتا بیٹا ٹام اس سے کافی سالوں سے ملنے نہیں آیا تھا۔ سالگرہ اور دیگر مواقع پر کارڈز' گفٹ البتہ ضرور بھیجتا رہتا تھا۔ میگی اس کے انتظار میں سراپا آنکھیں بن کر رہ گئی تھی۔ دراصل اس کا بیٹا اپنے بیوی بچوں کے ساتھ اب کسی دوسری ریاست میں جا کر بس گیا تھا' مگر چونکہ اسے اپنی ماں کی دیوانی محبت کا احساس تھا اس لیے وہ ایک اچھے بیٹے کی طرح ماں کو دکھ نہیں پہنچانا چاہتا تھا اس نے ماں سے اب تک یہ بات چھپائے رکھی تھی کہ وہ اس شہر سے جا چکا ہے اس کی ماں یہی سمجھے رہتی تھی کہ ٹام اسی شہر میں موجود ہے' صرف مصروفیت کی وجہ سے ملنے نہیں آتا۔

بوڑھا فریڈ بھی اسی قسم کی یاسیت کا شکار رہتا تھا۔ وہ اپنے زمانے کا مشہور گولفر رہ چکا تھا لیکن اب گنٹھیا کے مرض نے اس تقریباً

اپاہج بنا کر رکھ دیا تھا۔ اسے گولف تو ترک کر دینی پڑی لیکن دل تو کسی طور لگانا ضروری تھا اس لیے اس نے برڈ واچنگ کا مشغلہ اپنا لیا۔

وہ سارا سارا دن آنکھوں پر دوربین چڑھائے اپنے کمرے کی کھڑکی کے آگے بیٹھا چڑیوں کا نظارہ کرتا رہتا۔ المیہ یہ تھا کہ سرد موسموں کے اس شہر میں چڑیاں بہت کم ہوتی تھیں جو ہوتی تھیں وہ برف کا لباس پہنے درختوں سے نفرت کرتی تھیں اس لیے اپنے آشیانے سمیٹ گرم علاقوں کی طرف ہجرت کر جایا کرتی تھیں۔

فریڈ' مہینوں ان چڑیوں کے لوٹ آنے کا انتظار کیا کرتا تھا۔ اسے امید سے زیادہ ان پر بھروسہ تھا کہ وہ ضرور واپس آئیں گی اور وہ واقعی موسم کے بدلتے ہی وفادار دوست کی طرح اس سے ملنے واپس آ جاتیں۔ اسے چڑیوں کے بارے میں مکمل معلومات اور ان کی ہر خصوصیت کا اچھی طرح علم تھا۔

مارچ اپریل کے ٹھنڈے موسم میں اگر کوئی بھولی بھٹکی نیلی Blue Jay چڑیا اپنی بے سری آواز میں ٹیں ٹیں کر کے اسے ہیلو کہہ ڈالتی تو وہ سارے نرسنگ ہوم میں شور مچا دیتا۔ ''بہار آ رہی ہے! بہار آنے کو ہے!''

اس کی سب سے محبوب چڑیاں ہمنگ برڈز تھیں۔ ننھی منھی کھلونوں جیسی جسامت رکھنے والی یہ چڑیاں موسم بہار کے آتے ہی تتلیوں کی طرح ادھر ادھر اڑنا شروع کر دیتیں۔ فریڈ بڑے اہتمام سے ان کے لیے رنگین شیرہ بناتا پھر ایک بوتل میں بھر کر اپنے پچھواڑے میں درخت پر الٹی لٹکا دیتا۔ اس طرح صرف بوند بوند شربت ہی ٹپکتا تھا۔

یہ عجیب کھیل فریڈ کی من پسند مصروفیت اور دل لگی تھی۔ یہ ایک ایسا نظارہ تھا جس سے وہ کبھی تھکتا نہ تھا۔ جیسے ہی بوتل سے شیرے کا قطرہ ٹپکتا' شکر خوروں کا جوڑا اسے اپنی چونچ میں پکڑنے کی کوشش کرتا۔ باری باری شیرا پی لینے کے بعد وہ نہ جانے کتنی ہی دیر ہوا میں معلق رہتے۔ ایسا لگتا تھا جیسے قدرت نے ان کے اندر کوئی معلق کر دینے والی مشین لگا رکھی ہے۔ ورنہ ایسا کیسے ممکن تھا کہ وہ نہ تو اڑیں اور نہ ہی نیچے گریں۔ فریڈ گھنٹوں آنکھوں پر دوربین چڑھائے شکر خوروں کے جوڑے کا نظارہ دیکھ کر اپنے آپ کو محظوظ کرتا رہتا۔ وہ چڑیوں سے دوستی کر کے زندگی کے باقی ماندہ دن بڑے حوصلے سے بتا رہا تھا۔

خوڈ نائنٹی نائن! کوڈ نائنٹی نائن!

ڈاکٹر اسلم دوڑتا ہوا لفٹ میں سوار ہوا اور ایمرجنسی روم کی طرف بھاگا۔ نرسنگ ہوم میں اس وقت جتنے بھی ڈاکٹر تھے سبھی اپنے کام کاج چھوڑ کر وہاں پہنچ چکے تھے۔

ڈاکٹر اسلم نے کارڈیالوجسٹ ہونے کی وجہ سے فوراً ہی گریس کے رکے ہوئے دل کی چھاتی مساج شروع کر دی۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اسے منہ سے سانس بھی دیتا جا رہا تھا۔ نرسیں بھی تیار کھڑی تھیں' کسی بھی وقت زندگی اور موت کی آنکھ مچولی میں زندگی ہار سکتی تھی اور موت جیت سکتی تھی زور زور سے مساج کرتے کرتے ڈاکٹر اسلم تھک کر ہانپنے لگا تو ایک دوسرے ڈاکٹر نے اسے ہٹا کر اس کی جگہ سانس دینا شروع کر دیا۔ اس نے سینے پر ایسے زور زور سے گھونسے رسید کئے کہ گریس کی ایک دو پسلیاں بھی تڑک گئیں۔ دل تو نہ جانے کیوں اور کیسے رکا ہوا تھا اور اس کی کیا مرضی تھی کہ دھیرے سے پھر چل پڑا۔ دل کی کبھی کسی کو کہاں سمجھ آئی ہے؟ مبارک سلامت کا شور مچ گیا۔ سب ڈاکٹر خوشی سے ایک دوسرے سے بغلگیر ہو گئے۔ الیکٹرو کارڈیوگرام پر سیدھی سیدھی سپاٹ لکیریں اب موجیں مارتی' زندگی کی لہروں میں تبدیل ہو کر ایک خوبصورت نظارہ پیش کرنے لگیں غریب دل' اپنے تھکا دینے والے تنہا سفر پر دوبارہ چل نکلا تھا۔ ایک زندگی بچا لینے کی خوشی میں نرسیں اور ڈاکٹر جتنے پرسکون نظر آ رہے تھے ڈاکٹر اسلم اتنا ہی افسردہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اپنے آپ پر دل ہی دل میں حیران تھا کہ اسے گریس کے بچ جانے کا افسوس سا کیوں محسوس ہو رہا تھا۔

اس طرح کی ویجی ٹیبل لائف جینے کا فائدہ؟

وہ اپنے پاس کھڑے انڈین ڈاکٹر سنگھ کو دھیرے سے اپنی زبان میں کہے بغیر نہ رہ سکا۔

یار ہمیں کیں؟ مائی جب تک جیتی ہے ہسپتال کو میڈیکل انشورنس کمپنی سے بل ادا ہوتے جائیں گے اور ہماری روانہ کی حاضری کے چارجز علیحدہ ہمیں مائی کی زندگی کی مقصدیت سے کیا لینا دینا!

وہ ہنسنے لگا۔

واقعی ٹھیک کہتا ہے ڈاکٹر سنگھ۔ اسلم نے اپنے دل کو سمجھایا۔ ہمارا کام یہاں سے کمانا ہے۔ ہمیں کسی کی تنہائیوں سے کیا غرض۔ کسی کی زندگی میں خوشیوں کے پھول کھلانا تو ہمارے فرائض میں شامل نہیں ہے۔

شکر ہے یار اپنے دیس میں ہمارے بزرگوں کا یہ حال نہیں ہوتا۔ یہ بے چاری مائیاں' بابے مرتبان میں اچار کی طرح اس نرسنگ ہوم میں سالوں سے پڑے بے جان زندگی گزارتے رہنے پر مجبور ہیں۔ ادھر اپنی طرف تو اپنے بزرگوں کی بڑی ٹور ہوتی ہے نا!

ڈاکٹر سنگھ اور اسلم' کوریڈور میں سے لفٹ میں سوار ہوتے باتیں کرنے لگے۔ ڈاکٹر سنگھ بڑی شگفتہ طبیعت کا مالک تھا۔ باتوں باتوں میں پھلجھڑیاں چھوڑنا اس کی پرانی عادت تھی۔

یار میں تو شکر کرتا ہوں۔ میری اماں حالانکہ اب کافی بوڑھی ہیں مگر پھر بھی ایک بھرپور زندگی گزار رہی ہیں بیک ہوم بڑے بھائی جان اور ان کی فیملی کے ساتھ رہتی ہیں۔ پھر میری بہن شیریں آپا بھی اسی شہر میں ہیں۔ اماں کو اسلم سوچنے لگا۔ جوانی میں بھی اپنے اردگرد محفل سجائے رکھنے کی عادت تھی' محلے ادھر کی کہنے سنانے کو آن موجود ہوتے تھے۔ اماں پل بھر کو بھی تنہا نہ رہتی تھیں' بلکہ ابا نے تو لاڈ میں ان کا نام رانی اندر رکھ چھوڑا تھا۔ جب دفتر سے آتے' اماں کے اردگرد کوئی نہ کوئی محفل سجی دیکھ کر ہلکی سی مسکراہٹ بھری طنز لگاتے۔ رانی اندر کا اکھاڑہ لگا ہوا ہے! جناب ہمیں بھی کبھی پوچھ لیا کریں۔

اور اماں جھٹ پٹ اٹھ کھڑی ہوتیں۔

یہ ساتھ والی تو بس ابھی آئی تھیں اور منا کہہ رہا تھا دادی سے ہی کنگھی کرواؤں گا۔ شیریں بھی اپنی منی چھوڑ کر ابھی شاپنگ کو گئی ہے' ورنہ میں تو صبح سے اکیلی بیٹھی تھی۔

وہ ابا کو بھی باتوں میں لگا لیتیں اور ابا ان کی باتیں سنتے ہنکارے بھرتے چلے جاتے۔ اماں کی چٹپٹی باتوں اور دلچسپ چٹکلے سن کر ابا بھی بیچ بیچ میں ہنس پڑتے۔ کتنی اچھی اور پیاری جوڑی تھی ان کی۔

جب سے ابا رخصت ہوئے تھے اماں میں بھی بہت تبدیلی آ چکی تھی۔ کچھ بیمار بھی رہنے لگی تھیں مگر شکر تھا کہ اپنے بال بچوں میں تھیں اور یقیناً اب بھی اسی طرح رانی اندر۔ بنی بیٹھی رہتی ہوں گی بھائی جان کے بچے اور بیوی انہیں گھیرے رکھتے ہوں گے۔

یار کچھ عرصے سے مجھے اپنے اماں بہت یاد آ رہی ہیں۔ سوچ رہا ہوں کہ پاکستان کا چکر لگا ہی آؤں۔

اسلم نے ڈاکٹر سنگھ سے اظہار خیال کیا۔

تجھے تو کافی عرصہ نہیں ہو گیا گھر گئے ہوئے؟ ڈاکٹر سنگھ نے استفسار کیا۔

ہاں یار تقریباً تین سال ہونے کو آئے ہیں۔ مگر خیر میں باقاعدگی سے اماں کو پیسے' چیزیں وغیرہ بھیجتا اور فون بھی کرتا رہتا ہوں۔ میں ان کا خیال تو رکھتا ہوں مگر کیا کروں مصروفیت اتنی ہے کہ اسلم نے خلاؤں میں گھورتے ہوئے کہا' پاکستان کا چکر ہی نہیں لگتا۔ مگر اسے اپنی ہی آواز کچھ اجنبی سی محسوس ہوئی۔

ڈاکٹر اسلم پائن ویلی نرسنگ ہوم کی بوڑھیوں اور بوڑھوں میں بہت مقبول تھا۔ وہ ان کے ساتھ محبت اور توجہ سے پیش آتا اور ان کی باتوں میں دلچسپی لیتا تھا جس کی وجہ سے وہ اس کے راؤنڈ کا بڑی بے تابی سے انتظار کرتے تھے۔

ایک بوڑھی اسے کروشیئے کے رومال بن بن کر ہر تہوار پر تحفے کے طور پر دیا کرتی اور ایک اس کے لیے طرح طرح کی چاکلیٹ

اور کینڈی اپنی حصے میں سے یوں بچا بچا کر رکھتی جس طرح وہ کوئی بچہ ہو۔ اسلم جب انہیں بتاتا کہ اس کے دیس میں بڑے بوڑھے' خاندان کے فالتو افراد نہیں بلکہ سربراہ سمجھے جاتے ہیں تو امریکنوں کے منہ حیرت سے کھلے کے کھلے رہ جاتے۔

ہمارے کلچر میں تو ضروری خاندانی امور طے کرتے وقت بڑے بوڑھوں سے مشورہ اور اجازت لی جاتی ہے۔ ان کے ادب اور رتبے کی تعظیم میں کئی بار اپنی خواہشات بھی قربان کر دینی پڑتی ہیں۔

وہ بڑے فخر سے انہیں بتاتا۔

لیکن یہ تو پھر جوان لوگوں کے ساتھ بے انصافی ہے۔ بھئی آخر ان کو اپنی زندگی اپنی طرز سے گزارنے کا پورا حق ہونا چاہئے اس طرح تو بڑے ان کی زندگی میں دخل اندازی کرتے اور ان کی حق تلفی کرتے ہیں۔

امریکن کلچر میں پلے بڑھے بوڑھے کہتے۔ وہ اس آئیڈیالوجی سے مختلف کسی اور آئیڈیالوجی سے واقف ہی نہیں تھے سو وہ کیا سمجھتے۔

ہاں ماں باپ کو بڑھاپے میں کبھی کبھار ملتے ضرور رہنا چاہئے۔ کیونکہ وہ تنہائی محسوس کرتے ہیں۔ اس خیال سے انہیں کوئی انکار نہیں تھا۔

آج گریس کے ہارٹ اٹیک کے بعد دوبارہ جی اٹھنے کے واقعے سے میں بہت ڈسٹرب ہوا۔ اماں بہت یاد آئیں۔

اسلم نے رات اپنے بستر میں سونے سے پہلے اپنی بیوی ناہید سے گفتگو کرتے ہوئے کہا۔

تو آپ ہو آیئے نا پاکستان۔ آخر آپ کو گئے ہوئے کافی عرصہ ہو گیا ہے۔ ناہید نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

اسلم نے سوالیہ نظروں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا' جن میں یہ سوال تھا' کیا تم بھی میرے ساتھ چلوگی؟

آپ کو تو پتہ ہے سمسٹر ختم ہونے والا ہے۔ ورنہ جی تو میرا بھی بہت چاہ رہا تھا کہ اب کے پاکستان چلوں۔

ناہید نے جواباً کہا۔

ناہید یونیورسٹی میں ایشین مذاہب پڑھاتی تھی۔ سمسٹر ختم ہونے کا تو صرف بہانہ تھا۔ دراصل جب سے اس کی اپنی سری فیملی' جس میں ماں باپ بہن بھائی امریکہ شفٹ ہوئے تھے' اسے اب پاکستان جانے میں کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ ویسے بھی وہ امریکہ میں بڑے مصروف اور بھرپور زندگی گزار رہی تھی۔ وہ عام پاکستانی عورتوں کی طرح محض ایک ہاؤس وائف ہی نہیں بلکہ ایک کیریئر وومن تھی۔ بچے بھی اب ٹین ایج میں تھے اس لیے اپنا اپنا خود خیال رکھ سکتے تھے۔ ان کی اپنی سکول Activities تھیں' آفٹر

سکول پروگرام تھے۔ ناہید خود بھی وائی ایم سی اے میں بڑی اہم حیثیت رکھتی تھی۔ سارے ٹینس ٹورنامنٹ آرگنائز کروانا اور سوئمنگ کے مقابلوں کی ہار جیت کا فیصلہ کروانا' اسی کے ذمے تھا۔

اتنی مصروف زندگی میں سے وہ اب پاکستان جانے کے لیے کیسے وقت نکال سکتی تھی۔

اسلم نے چند ہی روز میں پاکستان کے لیے فلائٹ ریزرو کروالی اسے اچانک اماں کی یاد نے بہت تڑپانا شروع کر دیا تھا۔

بڑے بھائی جان' جس کے ہاں اماں رہائش پذیر ہیں' کاروباری آدمی تھے۔ موٹر پارٹس کے منافع بخش بزنس میں وہ اب بہت اچھی طرح اپنی ساکھ بنا چکے تھے۔ اللہ نے معاشی خوشحالی سے نواز رکھا تھا۔

گھر' ایک پرانی وسیع وعریض کوٹھی تھا' جو شروع سے ہی ان کے ابا کے خاندان میں چلی آ رہی تھی۔ اماں بیاہ کر بھی اسی گھر میں آئی تھیں اور ابا بھی یہیں سے رخصت ہوئے تھے۔

ماڈل ٹاؤن میں اب بھی اس طرز کی کافی پرانی کوٹھیاں موجود' عہد رفتہ کی یاد دلاتی رہتی ہیں۔

مئی کا گرم مہینہ اپنے انجام کو پہنچنے والا تھا مگر بھائی جان کی ایئر کنڈیشنڈ گاڑی میں بیٹھ کر ائیر پورٹ سے گھر کو جاتے ہوئے اسلم کو قطعاً گرمی نہیں محسوس ہو رہی تھی۔

وہ تین سال بعد پاکستان آیا تھا۔ کتنا بدلا بدلا اور عجیب عجیب سا لگ رہا تھا سب کچھ۔ نئی نئی عمارات جا بجا تعمیر ہو چکی تھیں۔ مگر سڑکیں اب بھی ٹوٹی پھوٹی' ہوائیں اب بھی گرد آلود اور درخت اب بھی گھنے اور سایہ دار تھے۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر شیشے سے باہر کا منظر یوں دیکھ رہا تھا جس طرح اس منظر اور اس میں موجود تمام چیزوں کو اپنے اندر سمو لینا چاہتا ہو۔ وہ کسی بھی احساس' کسی بھی تاثر' کسی بھی تجربے کو ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اب تو امریکہ میں بیس سال گزار لینے کے بعد پاکستان آنا بذات خود ایک انوکھے تجربے کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس لیے وہ اب اس انوکھے تجربے سے مکمل طور پر محظوظ ہونے کے ارادے سے یہاں آیا تھا۔

کار ان کی کوٹھی کی لمبی سی ڈرائیو وے میں چپکے سے داخل ہو گئی۔ لان کے ساتھ ساتھ لگے پرانے پرانے آموں کے درختوں کے جھنڈ' اسی طرح شاہانہ انداز میں کھڑے تھے اور ان پر آئی ہوئی ہری ہری امبیاں سبز نگینوں کی طرح جگمگاتی' بہت بھلی لگ رہی تھیں۔

وقت یکا یک بہت سال پیچھے چلا گیا۔

طارق بھائی' اسلم اور شیریں کے ساتھ ساتھ شاید اماں کا بھی بچپن کا زمانہ تھا۔ کیونکہ وہ بھی اپنے بچوں کے ساتھ گھاس میں

لوٹنیاں لگا تیں اور آگے پیچھے دوڑیں لگایا کرتی تھیں۔ ان کی ذات پھلجھڑی کی طرح چہکارے مارتی تھی۔

تب اماں کتنی جوان چاق و چوبند اور توانا ہوا کرتی تھیں۔ چھوٹی عمر میں شادی اور بچے ہو گئے اس لیے طبیعت میں لاابالی پن اور شوخی ہمیشہ موجود رہی۔ ابا نے بھی انہیں بہت نازوں سے رکھا ہوا تھا اور اماں بھی کسی سر کی ہوئی خوبصورت' نغمے بکھیرنے والی ستار سے کم دلکش نہ دکھتی تھیں۔

ڈرائنگ روم میں بٹھاتے ہی اسلم کو آم کا سکوائش پلایا گیا۔ طارق بھائی جان کی بیوی سلمیٰ اور بچے بھی چاچا کے اردگرد اکٹھے ہو گئے۔

اتنے سالوں بعد دوبارہ اس گھر میں آ کر اسلم نے فوراً نوٹ کیا کہ گھر میں بہت سی تبدیلیاں نظر آ رہی تھیں۔ وہ پرانا سا کورنس جس پر ہمیشہ سے اماں ابا اور ان کے تینوں بچوں کی تصاویر سجی رہتی تھیں اب ایک جدید طرز کے فائر پلیس میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اس کے عین بیچوں بیچ دیوار کے اوپری حصے پر البتہ بھائی جان بھابھی سلمیٰ اور ان کے بچوں کی بڑی سی رنگین تصویر آویزاں تھی۔ کمرے مختلف قسم کے آرائشی سامان اور بیش قیمت اینٹیکس سے بھرا ہوا تھا۔ سب لوگ بڑے خوشگوار موڈ میں اسلم کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔

یکدم اسلم کو کمرہ بالکل خالی اور بے جان سا محسوس ہونے لگا۔

اماں کہاں ہیں؟ اس نے بے تابی سے نظریں ادھر ادھر دوڑائیں۔ حیرت ہے' اماں نہ تو ائیر پورٹ پر ہی اسے لینے آئی تھیں اور نہ ہی اب کمرے میں موجود تھیں۔

اماں اپنے کمرے میں ہیں اسلم

بھائی جان نے اس کا تجسس بھانپتے ہوئے اسے جواب دیا۔

اچھا چلیں ان سے مل لیتا ہوں۔

اسلم ان کے کمرے کی طرف چل دیا جو دائیں ہاتھ پہ پہلا کمرہ پڑتا تھا۔

ارے ارے! ادھر نہیں انکل! دادی اماں کا کمرہ تو اوپر ہے۔

اسلم کے دس سالہ بھتیجے سہیل نے اوپر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اچھا؟ اسلم نے استفسارانہ نظروں سے اپنے بھائی بھابی کی طرف دیکھا۔

دراصل نیچے والا کمرہ زیبی نے اپنے آرٹ سٹوڈیو اور سن روم کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا تھا' اس لیے اماں کو ہم نے اوپر شفٹ کر دیا ہے۔

ویسے بھی نیچے بہت Disturbance ہوتی ہے۔ اوپر آرام اور سکون سے رہتی ہیں وہ!

طارق بھائی نے وضاحت کی۔

اماں کو تو اوپر کے کمروں سے ہمیشہ سے بہت وحشت ہوتی تھی۔ اسلم کو یاد تھا کہ بچپن میں جب بچے چھت پر چڑھ کر ساتھ والوں کے درخت سے جامنیں توڑنے کے لیے چپکے سے غائب ہو جاتے تو اماں پہروں نیچے کھڑے انہیں چیخ چیخ کر آوازیں دیا کرتیں مگر اوپر نہ آتیں۔

انہیں اوپر کے بند کمروں سے خوف آتا تھا۔ ایک بار دراصل ایک کمرے کا دروازہ باہر سے ہوا کے زور سے ایسا بند ہوا تھا کہ اسے کھولنے کے لیے مستری بلانا پڑا تھا۔ اماں اندر سردیوں کے لیے رضائیاں چیک کرنے گئی تھیں۔ اس واقعے سے وہ اتنی دہشت زدہ ہو گئی تھیں۔ کہ اس کے بعد انہوں نے اوپر کی منزل کے کمروں میں گھسنے سے توبہ کر لی تھی۔ بھائی جان کی فیملی نیچے ہی رہتی تھی۔ اوپر کے دوسرے خالی کمروں میں اب پرانا سامان' کاٹھ کباڑ اور فالتو اشیاء ڈال دی گئی تھیں۔

اماں کا کمرہ البتہ بہت خوبصورت' روشن اور کشادہ تھا۔ اسلم نے دیکھا کہ طارق بھائی نے اماں کے لیے اس پرانے کمرے کو ایک نئی شکل دے دی تھی۔ نیا فرنیچر' پردے' اے سی بھی کچھ تو تھا اس کمرے میں۔

زمین پر ایک طرف ملازمہ یوں بیٹھی ہوئی تھی جس طرح مستقلاً زمین سے جڑ گئی ہو۔

اماں! اماں! آنکھیں کھولئے! دیکھئے تو سہی کون آیا ہے!

طارق بھائی نے بڑے پر جوش طریقے سے اماں کو تقریباً جھنجھوڑ ڈالا۔

پتلے سے کمبل میں لپٹے ایک نحیف و نزار جسم نے کروٹ لی اور آنکھیں پٹ سے کھول دیں۔

اماں! اسلم بے اختیار اس بوڑھے ڈھانچے سے لپٹ گیا۔

اماں! کیسی ہیں آپ؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟ اتنی کمزور ہو گئی ہیں آپ اسلم بے اختیار بولتا چلا گیا۔

اماں کا سارا وجود آنکھیں بن گیا۔ چشم حیراں کی طرح ساکت ہو گیا۔ آنکھیں پتھرا کر ٹکر ٹکر دیکھتیں چلی گئیں۔ یہ آنکھیں کوئی اجنبی آنکھیں تھیں جو کچھ سمجھنے اور نہ سمجھنے کے بیچ ہچکولے کھا رہی تھیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے ' ایک اونچی سی آہنی دیوار دریا کے درمیان سے بلند ہو کر حائل ہوگئی۔ اور پانی منہ زور ہو کر اس دیوار کی دونوں اطراف زور زور سے ٹکرانے لگا۔

پانی کی لہریں اپنے ناخنوں سے کھرچ کھرچ کر اس دیوار میں سوراخ کر دینا چاہتی تھیں مگر سوراخ ہونا اتنا آسان دکھائی نہ دے رہا تھا۔

یکدم ایک آسمان تک اونچی لہر آئی۔ اس کی طاقت کے آگے آہنی دیوار پگھل سی گئی۔ اور پانی اپنے پورے زور کے ساتھ' اس دیوار کو بہتا دور تک اٹھا لے گیا۔

اسلم ! میرا بچہ میرا لال ! میرا چندا !

اماں نے یوں زور سے چیخ ماری جس طرح یکدم خواب دیکھتے دیکھتے جاگ اٹھی ہوں۔

اماں نے اسے دیوانہ وار لپٹا کر پیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ اسلم کی آنکھیں چھلکنے لگیں اور اس نے اماں کی گود میں سر رکھ دیا۔ اسے تو معلوم ہی نہ تھا۔ اب جب گود میں سر رکھ کر دیکھا تو ایک عجیب سی سرشاری اور سیرابی نے اسے بھگو کر رکھ دیا۔ اسے تو پتہ بھی نہ تھا کہ وہ کتنا پیاسا تھا اور اماں کی گود کا نخلستان کتنا ٹھنڈا' پر سکون اور سر سبز تھا۔

صبح سے گیا اب لوٹا ہے ! رات ڈھلنے کو آئی ! اماں نے کچھ مصنوعی خفگی سے کہا۔

کیا؟ اماں آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ اسلم نے کچھ بے یقینی سے اماں کو دیکھا۔ شاید اماں نیند میں کوئی خواب دیکھ رہی تھیں کیونکہ ابھی تو صرف شام کے سات ہی بجے تھے۔

اماں ! میں ہوں اسلم ! آپ کا اچھو ! اس نے اماں کا ہاتھ ہولے سے دبایا۔

ہاں ہاں پتہ ہے ! ادھر آ میرے لال ! تیرے سر کا صدقہ دوں یہ تیرے بال کتنے سفید ہو گئے ہیں اور موٹا بھی ہو گیا ہے۔ کیا ہو گیا رے تجھ کو؟

اماں کسی اور سیارے پر رہنے لگی تھیں شاید۔

چلو بھئی سب لوگ کھانا کھاتے ہیں نیچے چل کر ! بھابی نے پچوکشن کو سنبھال لیا اور بچے بڑے سب کھانے کی تیاری کرنے لگے۔

اسلم کی حیرت اب پریشانی میں بدل چکی تھی۔

اماں ! آئیں نا ! اسلم نے اماں کو بھی ہاتھ بڑھا کر دعوت دی۔

نہ میں کیوں جاؤں؟ میں تو اپنے گھر میں ہی ٹھیک ہوں۔ اپنا ہی کھاتی ہوں۔ یہیں کھانا کھاؤں گی انہیں جاتی کسی کے گھر۔

اچھا صغریٰ! چل کر اماں جی کا کھانا اوپر لے آؤ!

بھابی نے صغریٰ کو ہدایت دی اور سب لوگ نیچے اتر گئے۔

اسلم کھانے کی میز پر استفسارانہ انداز میں طارق بھائی کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ جواب چاہتا تھا۔ جلد از جلد مگر بھائیجان سنجیدہ چپ سے بیٹھے تھے۔

بھابی اماں کو کیا ہو گیا ہے؟ وہ ایسی تو نہیں تھیں کیسی الٹ پلٹ باتیں کر رہی تھیں! اسلم سے رہا نہ گیا۔

اسلم! دراصل اماں بیمار ہیں بہت زیادہ بیمار! انہیں Alzhiemer's Disease ہو چکی ہے۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ اس میں مریض کا حافظہ ختم ہونا شروع ہو جاتا ہے اور وہ حالات و واقعات کو آپس میں گڈمڈ کرنے لگ جاتا ہے۔ بس اسی لیے یہ حالت ہے ان کی۔ اور روز بروز بگڑتی جا رہی ہے ان کی حالت!

بھائی جان نے دکھ بھرے لہجے میں بتایا۔

اوہ مائی گاڈ! اسلم نے سر پکڑ لیا۔

لیکن آپ لوگوں نے تو کبھی بتایا ہی نہیں! بتایا تو ہوتا! وہ شاکی لہجے میں بولا۔

بتایا تھا لیکن آپ شاید بھول گئے ہیں۔ ایک دو بار بتایا تھا لیکن آپ نے اسے بڑے غیر سنجیدہ انداز میں سنا تھا۔ بلکہ آپ نے یہ بھی کہا تھا کہ بڑھاپا ہے آخر حافظے پر اثر تو ہوگا نا۔

بھابی نے اپنی صفائی پیش کی۔

لیکن مجھے اس بیماری کے اتنی شدت سے حملہ آور ہونے کا تو اندازہ نہیں تھا اماں تو حقیقت کی دنیا سے بہت دور جا چکی ہیں۔ غالباً... اسلم سے کھانا نہیں کھایا جا رہا تھا۔

پھر بھائی جان نے اسلم کو اماں کی بیماری کی اور تفصیلات بتائیں۔ انہیں تقریباً ڈیڑھ سال سے اس بیماری نے آہستہ آہستہ اپنی گرفت میں لینا شروع کیا تھا اور اب تو اماں مستقل کنفیوژن کا شکار رہتی تھیں وہ ڈاکٹروں بلکہ ماہر نفسیات تک سے اماں کا علاج کروا رہے تھے مگر اماں اب کافی مشکل طبیعت ہو چکی تھیں۔ کسی سے کسی قسم کا تعاون نہیں کرتی تھیں۔ مزاج میں چڑچڑاپن اتنا ہو گیا تھا کہ سیدھے منہ کسی سے بات نہیں کرتی تھیں۔

بس ایک صغریٰ ہی ہے جس سے اماں Relate کر لیتی ہیں' ورنہ ہم میں سے تو کوئی انہیں Handle نہیں کر سکتا!
بھابی نے کچھ طنز بھری شکایت کی۔
یہ کیا کہہ رہی ہیں بھابی! اماں تو بہت شوخ' دلچسپ اور میٹھی پر خلوص' طبیعت کی ہیں۔ بھول گئی آپ کہ وہ کیسی تھیں؟
اسلم نے ماں کا دفاع کیا۔
تھیں' ہیں نہیں۔ بھابی نے تائید کے لیے شوہر کی طرف دیکھا۔ وہ بھی سر ہلانے لگے۔
ہاں جی اسلم چچا' چلیں چھوڑیے اس ٹاپک کو' یہ بتایئے عمران اس سال ہائی سکول گریجویشن کے بعد کونسے کالج میں داخل ہو رہا ہے؟ طارق بھائی کی بیٹی زیبی نے اپنے ہم عمر کزن کے بارے میں دلچسپی سے پوچھا۔
عمران نیویارک سٹیٹ یونیورسٹی جا رہا ہے۔ آپ لوگوں کو بھی سٹیٹس آئے ہوئے کئی سال ہو گئے ہیں آ دنا عمران سے ملنے آپ لوگ۔ اسلم نے زیبی اور دوسرے بچوں کو مخاطب کیا۔
اگلے سال ضرور چکر لگائیں گے۔ بس اماں جی کی بھی تو بہت ذمہ داری پڑ گئی ہے اب۔
طارق بھائی نے ہولے سے کہا۔
خیر اماں کو تو صغریٰ سنبھال ہی لیتی ہے۔ ان کی کیئر تو ہر طرح سے کی جا رہی ہے اور کی جائے گی۔ وہ تو کوئی ایسا پرابلم نہیں ہے دراصل میں اب اپنی بوتیک کی وجہ سے بھی بہت مصروف رہتی ہوں نا۔ گرمیوں میں ویسے بھی بیرون ملک کے آرڈرز بہت آتے ہیں اس لیے دیکھیں کس طرح امریکہ کا پروگرام فٹ ان کرتے ہیں۔ ابھی کچھ کہہ نہیں سکتے!
ناہید بھابی اب ایک کامیاب بوتیک کی مالکہ بھی تھیں۔ اسلم کو تو پتہ بھی نہیں تھا۔
لیکن بھابی اللہ کے فضل سے بھائی جان کا ٹھیک ٹھاک کام چل رہا ہے پھر آپ کو بوتیک کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟
میرا مطلب ہے؟
انکل! آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ ہر کام پیسوں کے لیے ہی تو نہیں کیا جاتا۔ آخر امی اپنی ذات کی تسکین کے لیے کچھ اپنا بھی تو کر سکتی ہیں نا۔ اپنی Achievement کی بڑی بات ہوتی ہے آپ سمجھ سکتے ہیں نا؟
زیبی ایک ماڈرن پاکستانی لڑکی تھی۔ اسلم کو اس کی اور اپنی بیٹی لیلیٰ کی سوچ میں ذرہ بھر بھی فرق محسوس نہیں ہوا۔ حیرت البتہ ضرور ہوئی کہ اتنے مختلف معاشروں میں پلنے والی لڑکیوں میں بھی اب ایک سی قدریں ہی پرورش پا رہی ہیں اور وہ ایک سی سوچ رکھتی

ہیں۔اس وقت لیلیٰ بھی ہوتی تو یہی جواب دیتی!

بس اسلم بھائی!I wanted to find myself

بھابی نے بڑے فخریہ انداز میں کہا۔

اوراب میں اپنے ذاتی پراجیکٹ' اپنی بوتیک کے کام سے بہت مطمئن محسوس کرتی ہوں۔ بڑا مزا آتا ہے۔زندگی کے بھرپور ہونے کا احساس ہوتا ہے۔

اسلم مہینے کی چھٹی لے کر آیا تھا مگر دن اتنی تیزی سے گزر رہے تھے کہ پتہ بھی نہیں چل رہا تھا۔ بھائی جان بھابی اسے ہر طریقے سے محفوظ کرتے اور بچے بھی بہت کمپنی دیتے تھے۔

اماں بھی اسلم کی موجودگی کا اچھا اثر قبول کر رہی تھیں۔پہروں اس سے باتیں کیا کرتیں۔ان باتوں میں اکثر واقعات کو گڈ مڈ کر جایا کرتیں یا نام بھول جاتیں۔ڈاکٹر بھی باقاعدگی سے چیک اپ کو آتے۔

اس کی بہن شیریں بھی اسی شہر میں ہونے کیوجہ سے ہفتے میں ایک دو چکر لگا لیتی مگر زیادہ دیر نہ رک سکتی۔شیریں کا خاوند شیریں کی ہر وقت گھر میں موجودگی پر بہت اصرار کرتا تھا۔اور شیریں بھی اس کی خواہش کے مطابق اس کے آگے پیچھے پھر کر اس کے اشاروں پر ناچنے میں ہی خوش تھی۔وہ وہ اپنے گرہستی کی رانی تھی کیونکہ اس کا میاں اس کی موجودگی کے بغیر پانی کا گلاس تک نہیں پیتا تھا اور وہ اپنی اہمیت کے اس احساس سے ہر وقت ساتویں آسمان چڑھی رہتی تھی۔

طارق بھائی' بھابی اور بچوں کی زندگیاں اپنی اپنی مصروفیات کے حصار میں قید تھیں ہر وقت کوئی نہ کوئی کہیں نہ کہیں جا رہا ہوتا تھا۔ بھائی جان کو شام کو کسی نہ کسی کھانے پر جانا ہوتا اور اکثر بھابی بھی ان کے ساتھ چلی جاتیں۔

ورنہ بھابی کی مارننگ کافی پارٹیاں اور بوتیک کے کپڑے ہی ان کا سارا وقت لے لیتے۔اب وہ دونوں میاں بیوی شہر کے ان معززین میں شامل ہو چکے تھے جو شہر میں ہونے والے ہر اہم فنکشن پر خاص طور پر مدعو کیے جاتے تھے۔

بچوں کے اپنے مشاغل تھے۔کسی کی سپورٹس ہو رہی ہیں تو کسی کی آرٹ نمائش۔کوئی وی سی آر کا غلام ہے تو کوئی اپنی ذات کی تسکین کے لیے لمبی ڈرائیو پر ہی نکلا رہتا ہے۔اسلم دیکھ کر حیرت زدہ ہو رہا تھا کہ پاکستان میں بھی اب کسی کے پاس ٹائم نہیں تھا۔

صغریٰ ہی اماں کو ناشتہ کرواتی' نہلاتی' دھلاتی اور کمپنی دیتی تھی۔اماں جیسے اب بچہ تھیں اور صغریٰ ان کی ماں کا نعم البدل بنتی جا رہی تھی۔

اس روز مون سون کی گھٹائیں شرارتیں کرتی کرتی اماں کے اوپر کے بیڈ روم تک چلی آئیں اور خوب بارش ہوئی۔ اسلم اماں کے پاس بیٹھا انہیں امریکہ کے قصے سنا رہا تھا مگر اماں نہ جانے کن خیالوں میں گم تھیں۔ یکدم موضوع بدل کر بولیں۔

بیٹا اب تو برسرروزگار ہو گیا ہے میرا کہا مان لے اور شادی کر لے!

جی اماں؟ اسلم نے مختصر جواب دیا۔ وہ اس قسم کی بات کے لیے ہرگز تیار نہ تھا۔

ویسے تو تم سب لوگ بہت ضدی ہو۔ اپنی من مانی کرتے ہو لیکن اب کی بار میرا کہا مان لو۔ صغریٰ بہت اچھی لڑکی ہے۔ میری بہت خدمت کرتی ہے اس سے اچھی بہو ہمیں بھلا کہاں ملے گی۔

وہ ایک ہی سانس میں بولے چلے گئیں۔ شکر ہے اس وقت صغریٰ نیچے چائے لینے گئی ہوئی تھی ورنہ اسلم تو شرمندگی سے سر پکڑ لیتا۔

بھائی جان کا سب سے چھوٹا بیٹا ندیم نہ جانے کب سے کونے میں کھڑا تھا۔ سنتے ہی ہنس ہنس کر چھیڑنے لگا۔

آنٹی صغریٰ! آنٹی صغریٰ۔ آئی لائک اٹ' انکل آئی لائک اٹ!

چل شیطان کہیں کا! اسلم نے اسے پیار سے سرزنش کی۔

یہ کون ہے؟ اماں یکدم اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔

ندیم ہے اماں! طارق بھائی کا سب سے چھوٹا بیٹا! اسلم بڑے تحمل سے بولا۔

خیر جو بھی ہے! ہاں تو میں کہہ رہی تھی۔

اماں! میری شادی تو ہو چکی ہے۔ ناہید' آپ کی بھانجی کے ساتھ! یاد نہیں آپ ہی نے تو ضد کر کے کروائی تھی اپنی پسند سے! بھول گئیں۔

اچھا! تو پھر طارق کی کر دیتی ہوں۔ ارے اتنی اچھی لڑکی ہے۔ ہاتھ سے نکل گئی تو روؤ گے سب سر پکڑ کے۔

اماں نہ جانے کن ریگزاروں میں بھٹک رہی تھیں۔ ریت گرم تھی پاؤں جل رہے تھے۔ ایک کے بعد ایک قدم رکھتیں مگر پھر بھی جھلس کر رہ جائے۔

اسلم گم سم ہو گیا۔

اس دن کے بعد وہ اماں کے پاس زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے لگا کیونکہ دن گزرتے جا رہے تھے اور اس کی چھٹیاں ختم

ہونے کو تھیں۔ وہ سوچتا تھا نہ جانے اب زندگی میں اس دفعہ کے بعد اماں کے ساتھ مل بیٹھنا ممکن بھی ہوگا کہ نہیں۔

دل ہی دل میں شکر منا رہا تھا کہ اماں اکیلی نہیں تھیں بلکہ پوری بھری پری فیملی کی بیچ اپنے بڑھاپے کے دن کاٹ رہی تھیں۔

جب تک صغریٰ گاؤں سے واپس نہیں آتی 'اماں بے چین سی' بولائی بولائی سی اپنے کمرے میں پھرتی رہتیں۔

صغریٰ لوٹ کر آئی تو انہوں نے گلے شکوؤں کے انبار لگا دیئے۔

اتنے دن لگا دیئے۔ ماں کا کچھ خیال نہیں کہ اکیلی ہے۔ کیسی بیٹی ہے تو؟

صغریٰ نے انہیں لاڈ پیار کر کے منا لیا اور ان سے گھٹنوں بیٹھ کر اپنے گاؤں کے قصے کہانیاں کہیں۔ اماں کی زندگی میں گویا بہار سی آ گئی۔ پھول کی طرح کھل اٹھیں۔ بلکہ جوش میں آ کر اسے اپنا سونے کا کنگن دیکھ کر بھابی کا تو پارہ ہی چڑھ گیا۔

یہ تو نے کہاں سے لیا؟ وہ غرائیں۔

بیگم صاحب جی۔ اماں جی نے مجھے خود دیا ہے۔ بے شک پوچھ لیں جی! وہ ڈر گئی۔

پوچھ لیں کی بچی۔ تجھے نہیں پتہ کہ بڑی اماں کا دماغ ٹھیک نہیں ہے۔ اگر کل کو وہ تجھے کوئی اور چیز اٹھا کر دے دیں گی تو تو وہ بھی لے گی؟ تجھے عقل ہے کہ نہیں! تیرا بھی دماغ خراب ہے؟ ادھر لا۔ کنگن اتار! بڑی آئی اماں کی چہیتی۔ ان گھٹیا لوگوں کو منہ لگاؤ تو یہی ہوتا ہے۔ مالک ہی بن بیٹھتے ہیں میں کہتی ہوں اس لڑکی کو فوراً چلتا کر دیں ورنہ میرا نروس بریک ڈاؤن ہو جائے گا۔ بھابی نے اپنا سر پکڑ لیا۔

لیکن سلمٰی۔ اماں اس پر بہت Depend کرتی ہیں۔ وہ اس کے بغیر کیسے رہیں گی؟

طارق بھائی نے دبا دبا احتجاج کیا۔

دیکھئے ذرا عقل سے کام لیجئے۔ اماں ذہنی طور پر بیمار ہیں۔ اگر وہ نوکرانی کے نام کوئی پلاٹ لکھ دیں تو کیا یہ درست ہوگا؟ یہ نوکرانی انہیں ایکسپلائٹ کر رہی ہے؟ ہم کوئی اور ملازمہ رکھ لیں گے۔ پلیز ٹرائی ٹو انڈرسٹینڈ۔

سب خاموش ہو گئے۔ صغریٰ کو تنخواہ دے کر اور کنگن اتروا کر چھٹی دے دی گئی اماں کو یہی بتایا کہ وہ خود ہی کہیں چلی گئی ہے۔ مگر اماں نے اس حقیقت کو آسانی سے قبول نہیں کیا۔ رنج و غم سے پاگل ہی تو ہو گئیں۔ چیزیں اٹھا اٹھا کر دیواروں میں دے ماریں۔

بھابی اگلے دن بڑے پیار سے ان کا ناشتہ اپنے ہاتھوں سے ٹرے میں سجا کر لے گئیں مگر اماں نے توس مکھن اٹھا کر پھینک دیئے اور چائے کی کیتلی اپنے اوپر انڈیلنے لگیں۔ وہ تو شکر ہوا بھابی نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور چائے ان کے جسم کے بجائے بستر پر گر گئی

ورنہ وہ بری طرح جھلس کر رہ جاتیں۔ اماں بری طرح چیخنے لگیں۔

شی از امپاسیبل! بھابی بڑبڑاتی ہوئی نیچے اتر آئیں۔

بھئی کچھ دن میں غصہ دھیما پڑ جائے گا! حوصلہ رکھو! طارق بھی نے بیوی کو حوصلہ دیا۔

نئی ملازمہ ڈھونڈلی گئی مگر اماں نے اس سے سیدھے منہ بات تو در کنار اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔

بچوں! آپ لوگ اپنی دادی اماں کے پاس جا کر بیٹھا کریں نا۔ وہ تنہائی محسوس کرتی ہوں گی۔ ان کے ساتھ وقت گزار کر دیکھیں تو سہی آپ کتنا Gain کریں گے! بزرگوں کا بہت تجربہ ہوتا ہے۔ اور نئی نسل کو تو اس سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہیے۔

اسلم نے اپنے بھیجتے اور بھیجتی کو پیار سے سمجھایا کیونکہ وہ بھی اوپر کا رخ قطعاً نہیں کرتے تھے۔

انکل میں تو آج کل اپنی آرٹ کی نمائش کی تیاری میں بے حد مصروف ہوں ٹائم ہی نہیں ملتا۔ ویسے بھی دادی اماں کو اس سٹیج پر زیادہ Relaxation کی ضرورت ہے۔ انہیں کیا ڈسٹرب کرنا۔

زیبی نے بڑے آرام سے اپنا پلہ چھڑوالیا۔

انکل میں تو جاتا ہوں اوپر! کبھی کبھار سلام کر آتا ہوں انہیں اور اب ان سے کیا بات کریں! یو نو جنریشن گیپ بھی تو ہوتا ہے۔ ویسے بھی سوری ٹو سے' شی از ناٹ ان ہر سینز! بڑے بیٹے نوید نے بے نیازی سے کندھے اچکا دیے۔

نوید! بدتمیزی نہ کرو! طارق بھائی نے اسے گھورا۔ اسلم کا چہرہ تمتمانے لگا۔

اماں نے اب بولنا تقریباً بند کر دیا تھا۔ سارا سارا دن کروٹ لیے خلاؤں میں گھورتی رہتیں۔ کوئی اوپر نہ آتا تو گلہ نہ کرتیں مگر کوئی آجاتا تو بھی یوں ہی پڑی رہتیں جیسے انہیں کسی کے آنے جانے یا موجودگی کا احساس نہ رہا ہو۔

اسلم زبردستی کچھ کھلا پلا دیتا تو کھا لیتیں مگر منہ سے کچھ نہ مانگتیں۔ طارق بھائی بھابی بھی کافی پریشان تھے۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ ان کی شخصیت میں Withdrawal پیدا ہو گیا ہے۔ اور یہ کیفیت انہیں نارمل دینا سے مزید دور لے جائے گی۔

اسلم رات کو لیٹا اماں ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اس کی بیوی ناہید کا امریکہ سے فون آ گیا۔

کیا بات ہے؟ واپس آنے کا ارادہ نہیں کیا؟ آپ تو وہیں کے ہو کر رہ گئے ہیں جب سے گئے ہیں کوئی فون بھی نہیں کیا؟ ناہید نے شکووں کا دفتر کھول دیا۔

ابو! جلدی واپس آئیں آپ کو تو پتہ ہے ہم نے ڈزنی لینڈ دیکھنے کے لیے فلوریڈا کا پروگرام بنایا ہوا ہے۔ ساری چھٹیاں گزرتی

جا رہی ہیں۔ ہمارا وقت ضائع ہو رہا ہے ابو! کب آ رہے ہیں؟

اس کے بیٹے عمران اور عدنان فون پر باری باری بول رہے تھے۔ اسلم کو یکا یک اپنا گھر یاد آنے لگا۔ اپنی بیوی' بچے' آرگنائزڈ قسم کی زندگی مسئلوں سے دور۔ پاکستان کی الجھنوں سے اوجھل' سکھ چین کی بستی۔

اسلم نے انہیں ایک ہفتے میں آنے کی خبر سنادی اور ان کی خوشی کا اندازہ کر کے مسکرا کر فون رکھ دیا۔

اگلی شام بھائی جان بھابی نے اپنے گھر ایک بہت عظیم الشان ڈنر دیا ہوا تھا۔ شہر کی معززین' منسٹر اور پریس بھی مدعو تھا۔ رنگ و بو کا ایک طوفان سا بپا تھا۔

اسلم بھی بھائی جان کے فرینڈز سے ملتا گپ شپ کرتا رہا' بہت پر لطف محفل اور پر تکلف کھانا تھا۔

مہمانوں کو رخصت کرتے ہوئے رات کا تقریبا ایک بج گیا۔ سب لوگ تھک گئے تھے۔ اکرم سونے سے پہلے اماں کو خدا حافظ کہنے کی غرض سے دبے پاؤں ان کے کمرے میں داخل ہوا' اس خیال سے کہ وہ کہیں جاگ نہ جائیں۔ ان کی نئی ملازمہ زمین پر ایک طرف گچھا بنی سو رہی تھی مگر اماں اپنے بیڈ پر موجود نہیں تھیں۔

شاید باتھ روم میں ہیں۔ یہ سوچ کر اسلم نے کچھ دیر انتظار کیا مگر پھر گھبرا کر دروازے دھیرے سے کھول کر دیکھا اماں وہاں بھی موجود نہیں تھیں۔

اسلم نے فوراً کمرے کی بتیاں جلا کر نوکرانی کو جگا دیا اور چیخ کو پوچھنے لگا۔

اماں کہاں ہیں؟

نوکرانی آنکھیں ملتی اٹھ بیٹی۔ اس نے سستی سے ایک لمبی سی انگڑائی لی۔ اسے بات کو سمجھنے میں بھی کچھ دیر لگی۔ اسلم نے ایک بار پھر اپنا سوال دہرایا۔

لڑکی نے ادھر ادھر دیکھا پھر یکا یک کھڑی ہو گئی۔

بستر پر ہی تھیں صاحب جی! اب پتہ نہیں کہاں گئی ہیں؟ مجھے تو کچھ پتہ نہیں جی۔ میں تو سو رہی تھی۔

تو سو گئی تھی۔ تجھے سونے کے لیے یہاں نوکر رکھا ہے یا اماں کا خیال رکھنے کے لیے! جلدی سے ڈھونڈ ان کو۔

اسلم غصے سے پاؤں پٹختا تیزی سے نیچے اتر گیا۔ اور جا کر بھائی جان بھابی کو جگا کر صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ سب لوگوں نے اماں کو تلاش کرنے میں گھر کا کونہ کونہ چھان مارا۔ مگر اماں نہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھیں۔

اوہ مائی گاڈ! گھر کا باہر کا گیٹ کھلا دیکھ کر اسلم اور طارق بھائی 'ٹپٹا کر رہ گئے۔ چوکیدار سے پوچھا تو اس نے لاعلمی ظاہر کی۔ مہمانوں کی آمد و رفت میں نہ جانے کس وقت اماں گیٹ سے شاید باہر جا چکی تھیں اور کسی کو پتہ نہیں چل سکا تھا۔

اب کیا کریں! نوید بولا۔

بھائی جان میرا خیال ہے سب سے پہلے ہمیں پولیس کو اطلاع کر دینا چاہئے ان کی مدد حاصل کرنی چاہئے۔ اسلم نے تجویز پیش کی۔

نہیں یار! یہاں پولیس ولیس کچھ نہیں کرتی۔ الٹا رشوت اور تھانوں کے چکر گلے پڑ جائیں گے۔ خود ہی چل کر ڈھونڈتے ہیں ٹھہرو میں گاڑی نکالتا ہوں!

طارق بھائی 'اسلم اور نوید گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اس سے پہلے کہ گاڑی سٹارٹ ہوتی 'اماں کی ملازمہ ڈرتے ڈرتے پاس آ گئی۔

جی اماں شام سے ہی کچھ بڑبڑا رہی تھیں۔ جب میں نے پوچھا! اماں جی کیا کہہ رہی ہیں تو ڈانٹ کر بولیں۔

چپ کر! دیکھتی نہیں راجہ صاحب آئے ہیں۔ میں ان سے ہی بات کر رہی ہوں۔

پھر مجھے جا کر راجہ صاحب کے لیے نیچے سے چائے لانے کو کہا۔ میں تو ڈر گئی جی۔ وہاں تو کوئی بھی نہیں تھا۔ اماں جی کی باتیں بڑی عجیب تھیں جی!

وہ خاموش ہو گئی۔

بھائی جان اور اسلم کے دل پر گھونسا سا لگا۔ اماں 'ابو کو ہمیشہ راجہ صاحب کہہ کر پکارتی تھیں۔ دونوں بھائیوں نے ایک ساتھ ہی ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا اور طارق بھائی نے گاڑی قبرستان کی طرف موڑ دی۔

حیرت کی بات تھی۔ یقین نہ آنے والی حقیقت تھی مگر اماں نہ جانے کس طرح وہاں پہنچ چکی تھیں۔ جس روح نے جہاں پہنچنا ہوتا ہے وہاں وہ جسمانی ناتوانی کے باوجود کے طرح پہنچ جاتی ہے۔ راستہ کیسے سوجھتا ہے؟ اندھیرے میں روشنیوں کے چراغ کون بچھاتا ہے' پیروں میں بار بار چبھ جانے والے کنکر اور کانٹے کون نکالتا ہے؟ حوصلہ ٹوٹ جانے سے کون بچاتا ہے؟ اس وقت کون سے غیر مرئی میکانزم کام کرتے ہیں؟ یہ سب سمجھ میں نہ آنے والے عقدے ہیں۔ معمے ہیں۔

اماں 'ابو کی قبر پر بیٹھی ان سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں نہ جانے کون سے قصے کہانیاں کہے جا رہی تھیں۔ کونسی خبریں سناتی جا رہی تھیں۔ کونسے فسانے گوش گزار کر رہی تھیں۔ اماں کو اس طرح بولتے چالتے تو کسی نے عرصہ دراز سے نہیں دیکھا تھا۔

اماں! آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟ اتنی رات گئے اکیلی؟ طارق بھائی نے پیار سے ان کا بازو سہلایا۔

تم کون ہو جی! مجھ سے یہ سوال کرنے والے؟ دیکھئے راجہ صاحب یہ مجھ کو آپ سے ملنے سے روک رہا ہے!

وہ بچوں کی طرح بسورنے لگی۔

اماں۔ چلئے گھر ہم آپ کو لینے آئے ہیں۔ ابا جان بھی اب سونا چاہتے ہیں اور آپ بھی تھک گئی ہیں۔ اتنی دور پیدل چل کر آئی ہیں۔ صبح مل لیجئے گا ان سے۔ میں خود آپ کو لے کر یہاں آؤں گا! اسلم کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ اس کی پیاری لاڈلی ماں کا یہ حال دیکھ کر اس کا کلیجہ پھٹا جا رہا تھا۔

رات عجب بے کلی میں کٹی۔ کوئی بھی چین سے نہ سو سکا تھا۔

ناشتے کی میز پر سب خاموش گم سم بیٹھے تھے۔ اماں اپنے کمرے میں ابھی تک سو رہی تھیں ان کے ڈاکٹر نے انہیں بہت زیادہ آرام اور سکون پہنچانے کی ضرورت پر زور دیا تھا۔

شیریں کو بھی فون کر کے بلوا لیا تھا۔ فیملی ایمرجنسی کے وقت تو وہ کچھ نہ کچھ وقت نکال کر آ ہی جایا کرتی تھی۔

اماں کے تینوں بچے بہت فرمانبردار' شفیق اور محبت کرنے والے تھے۔ وہ اماں کی بہتری اور آرام کے لیے ہر ممکن آسائش مہیا کر سکتے تھے۔ علاج معالجہ کروا سکتے تھے' روپیہ پانی کی طرح بہا سکتے تھے۔ سبھی کچھ دے سکتے تھے سوائے وقت اور توجہ کے اور اماں کو اب ان چیزوں سے زیادہ ان دو چیزوں ہی کی زیادہ ضرورت پیش آتی تھی۔

اماں کے بارے میں سنجیدگی سے کچھ سوچنے کی ضرورت ہے۔

بالآخر شیریں نے وہ موضوع چھیڑ دیا جس کی وجہ سے وہ سب وہاں جمع تھے لیکن اب لب پر لانے سے ڈر رہے تھے۔

بھابی! برا نہ منایئے گا لیکن اماں تنہائی اور بے توجہی کا شکار ہیں۔ آپ اگر اپنی باہر کی کمٹ منٹس کچھ کم کر دیں تو... شیریں نے بات آدھی چھوڑ دی۔

شیریں یہ تو نہ کہو۔ اماں کی ہر طرح نگہداشت ہوتی ہے گھر میں کیا نہیں کرتے ہم ان کے آرام کے لیے۔ ملازمہ الگ رکھ کر دی ہوئی ہے حالانکہ وہ تو ملازماؤں سے اتنی Attach ہو جاتی ہیں کہ شرم آتی ہے۔ بالکل اپنا ہی بنا لیتی ہیں انہیں آپ کو پتہ ہی ہے!

تو وہ کیا کریں بھابی! نوکرانی سے دل نہ لگائیں تو کس سے لگائیں۔ آپ اور بھائی جان اور آپ کے بچے اتنے مصروف رہتے ہیں۔ ان سے باتیں کرنے کون جاتا ہے اوپر؟ آخر کسی ذی روح سے تو Attach ہونا ہی ہے انہوں نے!

جہاں تک بچوں کا تعلق ہے۔ شیریں تو آپ یہ کیوں بھول رہی ہیں کہ آپ کے بچوں کا بھی اتنا ہی فرض بنتا ہے جتنا ہمارے بچوں کا وہ کونسا نانی کی دلجوئی کرنے کبھی آئے ہیں۔ جب کبھی آئے نیچے ہی مل ملا کر چلے گئے۔ اوپر تو مہینوں قدم نہیں رکھتے۔ آپ بھی بس کھڑی کھڑی آتی ہیں۔ آپ کونسا بیٹی بن کر ان کے اردگرد منڈلاتی رہتی ہے۔ آپ کی ویمنز کلب کی ایکٹی ویٹیز بھی کافی زیادہ ہوتی ہیں۔

بھابی معاف کیجئے گا۔ میری اپنی لائف ہے اور ویسے بھی مجھ سے زیادہ یہ آپ کا فرض ہے۔ آپ بہو ہیں میں بیٹی! مزاج گرم ہونے لگے۔ ماتھوں پر بل پڑنے لگے۔

خیر آج کل ان اولڈ فیشن خیالات کا زمانہ نہیں کہ یہ صرف بہو کا فرض ہی بنتا ہے۔ بیٹی کیا؟ بہو کیا؟ اولاد اولاد ہوتی ہے میں ایسے خیالات میں یقین نہیں رکھتی ہم سب فیملی ممبر ہیں ہم سب کو اس پرابلم کو مل شیئر کرنا چاہیے!

پرابلم! گویا ہماری پیاری ماں اب پرابلم بن گئی ہیں! بوجھ بن گئی ہیں آپ سب پر!

شیریں فوراً روایتی نند بن گئی۔ دونوں طرف سے طعنے دیئے جانے لگے۔ اسلم اور طارق بیوقوفوں کی طرح ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

پلیز لیڈیز! کام ڈاؤن! یہ ہم سب کے سوچنے کی بات ہے آخر وہ ہم سب کی ماں ہیں ہمارا سانجھا سکھ اور دکھ ہے۔ مل کر بھی کسی فیصلے پر پہنچا جا سکتا ہے۔ ذرا حوصلے سے کام لیں۔ اسلم نے معتبر بن کر زبان کھولی۔

بالکل ٹھیک کہا' اسلم بھائی آپ نے! میں آپ سے مکمل اتفاق کرتی ہوں۔ اماں ہم سب کی ذمہ داری ہیں۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے تو طارق نے اور میں نے تو ہمیشہ سے ہی انہیں اپنے پاس رکھا ہے۔ خیال رکھنے کی کوشش کی ہے۔ چاہے اس حقیقت کو کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے۔

سلمٰی بھابی نے شیریں آپا کی طرف سنسنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

لیکن اب بدقسمتی سے وہ اس سٹیج پر پہنچ چکی ہیں کہ میرا خیال ہے ہم اکیلے انہیں نہیں سنبھال سکتے۔ آپ لوگوں کو بھی اس معاملے میں ہم سے تعاون کرنا چاہیے ہمارا ہاتھ بٹانا چاہیے۔ میں سوچ رہی تھی کیوں نہ اسلم بھائی جان انہیں اپنے ساتھ امریکہ لے جائیں۔ وہاں علاج کی بھی بہتر سہولتیں ہیں۔ پھر تبدیلی اماں کے لیے بھی شاید اچھی ثابت ہو۔ ایک نئی فضا۔ ایک نیا ماحول' کیوں شیریں کیا خیال ہے؟

بھائی نے کامیاب حملہ کیا۔ سومناتھ کے دروازے پٹ سے کھل گئے۔ شیریں کا چہرہ بھی اس نئی تجویز سے کھل سا اٹھا۔ اپنے سر پر سے بھی اسے منوں وزنی پتھر کھسکتا سا محسوس ہوا۔

راجدھانی کا نظام الٹ پلٹ سا ہو رہا تھا۔ رعایا بغاوت پر آمادہ تھی ہر کوئی اپنا مفاد چاہتا تھا۔ آزادی بغیر ذمہ داری۔ اور تو اور کوئی راجہ بننے پر بھی تیار نہ تھا۔

فضا حبس آلود ہو گئی۔ سانس رک سے گئے۔ یوں جیسے کسی نے یکدم آکسیجن بند کر دی ہو۔

کوڈ نائنٹی نائن! کوڈ نائنٹی نائن!

سپیکرز میں سے اناؤنسمنٹ ابل ابل کر در و دیوار پر بہنے لگی۔

جارج! جارج! ڈونٹ لیٹ می فال ڈاؤن!

بوڑھی ورجینا کا جسم پیٹیوں میں بندھا ہوا تھا مگر پھر بھی وہ گر جانے کے خوف میں مبتلا تھی۔ اور آہ و پکار کر رہی تھی۔

اسلم کو اپنا سر گھومتا ہوا سا محسوس ہونے لگا۔ اس کا تو خیال تھا یہ یہاں والوں کا اندرونی معاملہ ہے۔ ان کے اپنے سلجھانے کا مسئلہ ہے۔ وہ تو بیرون ملک سے آیا ہوا ایک مہمان' ایک خیر سگالی وزیر تھا' جو سب ٹھیک ہے! کا اطمینان اپنے سوٹ کیس میں ڈال کر اپنے ملک کی راہ لے گا۔

آندھی' طوفان' گرد و غبار' ماحولیاتی آلودگی پہ اظہار تاسف' ہمدردی کے چند میٹھے بول' مزید تباہی سے بچنے کے لیے نئی نئی تجاویز' مشورے' تھپکیاں دے کر اپنا جہاز پکڑ لے گا اور اللہ اللہ خیر صلا۔

کچھ عرصے بعد اماں کی یاد کے تیز رنگ وقت کے ساتھ ساتھ پھیکے پڑنے شروع ہو جائیں گے اور کام' کاج' مصروفیت' بیوی' بچے' روٹین لائف اسی طرح اپنے شکنجے میں جکڑ کر ادھ موا کر دے گی۔ ڈزنی لینڈ کا ٹرپ ہو گا' ناہید کی ٹیچنگ بچوں کی ایکٹی ویٹیز' سب کچھ حسب سابق حسب معمول جاری رہے گا۔

اماں بھلا وہاں کہاں فٹ ان ہوں گی؟

بھائی جان! ویسے خیال برا نہیں۔ کچھ دیر ناہید بھابھی کو بھی اماں جی کی خدمت کا موقعہ ملنا چاہئے نا۔ آخر وہ آپ کے بچوں کی بھی اتنی ہی دادی ہیں۔ وہ تو پاکستان بھی کم ہی آتے ہیں۔ بھلا انہیں دادی کو جاننے کا اس سے بہتر موقعہ کب ملے گا؟

شیریں فوراً سلمیٰ کی پارٹی بن گئی۔

بوڑھی ور جینا اندھی گھاٹیوں کی طرف گرتی جا رہی تھی۔ پہلے تو صرف اسے گرنے کا خوف ہی تھا۔ اب وہ واقعی گر رہی تھی۔ اس کی چیخوں سے اسلم کے کان پھٹنے سے لگے تھے۔ اس نے اسے بچانے کے لیے اپنے بازو آگے بڑھائے مگر اسے اپنے بازو لوہے کے بنے ہوئے محسوس ہوئے۔ اپنی جگہ سے ہلتے ہی نہ تھے۔ شل ہو چکے تھے۔

مگر اماں! وہاں جا کر کیا کریں گی؟ بال آخر اس کی زبان سے نکل ہی گیا۔

کرنا کیا ہے بھئی؟ گھر میں رہیں گی اور کیا؟ بھابی اور بچوں میں خوش رہیں گی! شیریں مسلسل زور دینے لگی۔

اماں امریکہ آ گئیں تو انہیں کون سنبھالے گا۔ ان سب کی زندگی اتھل پتھل ہو کر رہ جائے گی۔ زندگی اجیرن کر کے رکھ دیں گی! اس کا ذہن ہچکولے کھانے لگا راجدھانی میں بھگدڑ رچ چکی تھی۔ ہر کوئی اپنی زندگی بچانے کے لیے ادھر ادھر افراتفری کے عالم میں بھاگ رہا تھا۔ اپنے اپنے سروائیول کا مسئلہ تھا۔

ویسے اگر اماں کی بہترین نگہداشت ہی چاہئے اور ان کی بھلائی مقصود ہو تو (عافیت گھر) کو بھی Consider کیا جا سکتا ہے۔ میرا مطلب ہے.....

بھابی نے بات بیچ میں چھوڑ دی۔

عافیت گھر کیا ہے؟ اسلم نے دلچسپی سے پوچھا۔

بھئی مغربی طرزوں پر یہاں ایک بوڑھوں کے رہنے کا ادارہ قائم کیا گیا ہے۔ بلکہ میں تو ان کے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں سے ہوں۔ بزرگ خواتین حضرات کی ہر طرح سے دیکھ بھال اور دلجوئی کی جاتی ہے۔ مختلف ایکٹی ویٹیز ہوتی ہیں۔ میڈیکل سٹاف آن ڈیوٹی ہوتا ہے۔ واقعی بھابی! یہ تو بہت امپریس کرنے والی بات ہے! ویسے ایمان کی بات کہوں گا۔ پاکستان نے ترقی بہت کر لی ہے۔ ڈش انٹینا' موبائل فون' انٹرنیشنل لیول کے سکول' رلوالونگ ریستوران اور اب یہ عافیت گھر! اچھا بھابی اور بتائیں وہاں کس طرح بزرگوں کا خیال رکھا جاتا ہے؟

اسلم نے کرسی کھینچ کر بھابی سے اور قریب کر لی اور دلچسپی سے سننے لگا۔



صدقہ

گرمی بھی اس دن کچھ زیادہ ہی زوروں پر تھی۔ مئی کا مہینہ آخری سانسیں لے رہا تھا۔ تپتی ہوئی لو اور جھلسا دینے والی سورج کی شعاعیں' گھر سے باہر نکلتے ہی انسان کو بے دم کیے دیتی تھیں۔

میں حسب معمول سودا سلف لینے بازار میں' ایک دکان سے دوسری دکان کے چکر لگا رہی تھی۔ گوشت' سبزی' دودھ اور دیگر ضروری اشیاء کی خریدار کے بعد بھی میرے پاس کچھ وقت بچ گیا تھا۔ میں ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ درزی کی دکان کا چکر لگاؤں یا نہیں کہ میری نظر ایک فالسہ فروش پر جا پڑی۔ ''ٹھنڈے میٹھے فالسے! باجی جی فالسہ لے لیں! مجھے دیکھتے ہی اس نے زور سے آواز لگائی۔

میں نے رک کر دیکھا۔ ایک پارک شدہ گاڑی سے اپنی سائیکل لگائے' ایک چودہ پندرہ سالہ نوجوان فالسہ فروش' فالسے کی چھابڑی سجائے کھڑا تھا۔ کالے کالے ننھے منے کھٹے میٹھے فالسے ہرے ہرے پتوں میں سجے بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔ میرے منہ میں پانی آنے لگا۔

فالسہ کیا بھاؤ دے رہے ہو؟ میں نے فالسوں کو بغور دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ آپ کھا کر تو دیکھیں باجی جی! بھاؤ کا فکر نہ کریں! اس نے مجھے چکھنے کی دعوت دیتے ہوئے ترازو سنبھالنا شروع کر دیا۔

کتنا تولوں؟

پہلے یہ تو بتاؤ کتنے روپے چھٹانک دے رہے ہو؟ میں نے پھر پوچھا۔

آپ کے لیے پانچ روپے باجی جی! بالکل مفت ہی سمجھئے نا۔ ویسے دوسروں کو میں چھ روپے کے حساب سے دے رہا ہوں۔ اس نے خالص کاروباری انداز میں کہا۔

میں نے تو شربت بنانا ہے۔ اگر ایک کلو تو چار روپے لگاؤ گے؟ میں نے بھی چالاکی دکھائی۔

اچھا اگر ڈیڑھ کلو لے لیں تو چار روپے کر دوں گا! وہ فالسہ چھانٹتے ہوئے بولا۔

شربت کے لیے ڈیڑھ کلو سے کم کیا لینا۔ یہاں تو بیگمات چار پانچ کلو لے کر جاتی ہیں مجھ سے۔ شربت بنا کر فریزر میں رکھ لیتی ہیں اور سارا سال استعمال کرتی رہتی ہیں۔

اس نے میری معلومات میں اضافہ کرنے کی کوشش کی۔

اچھا چلو بھئی دو کلو ہی کر دو۔ مگر ذرا جلدی جلدی! میں نے اس بحث سے جان چھڑاتے ہوئے کہا۔ گرمی میں مجھ سے مزید کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔

فالسے تولتے ہوئے اس نے اپنے ماتھے پر آیا ہوا پسینہ پونچھنے کے لیے سر پر بندھے صافے کے ایک پلو کو زور سے اپنے ماتھے پر رگڑا تو میں نے اس کے کپڑوں پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی۔ موٹی سی گھٹیا کوالٹی کی فلیٹ کا جوڑا پسینے سے بھیگ کر اس کے تن بدن سے چپک رہا تھا۔

بیٹا یہ تم نے اتنی گرمی میں اتنا موٹا جوڑا کیوں پہن رکھا ہے؟ کوئی پتلا ململ کا یا ویل لون کا کرتہ کیوں نہیں پہن لیتے، جس میں کچھ کم گرمی لگے؟

مجھ سے رہا نہ گیا۔

باجی جی کیا کریں! پتلا کرتہ بنائیں تو وہ زیادہ دیر چل نہیں سکتا۔ ہم تو ایسا کپڑا پہنتے ہیں جو ہنڈن سار ہو۔ گرمی میں تو یوں بھی کپڑے بار بار دھلتے ہیں جی! تو اس لیے پتلے کپڑوں کا نخرہ ہم غریب لوگ کہاں برداشت کر سکتے ہیں جی! اس کے جواب سے میں لاجواب ہو گئی۔

اچھے اچھے موٹے موٹے دانے ڈالنا بیٹا! یہ کچلے ہوئے مریل دانے مجھے نہیں چاہئے! میں نے ایک فالسہ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

باجی جی جاتی بہار کا تحفہ ہے' آدھا کلو اور نہ کر دوں! وہ زبردستی مجھے اور فالسے بیچنے کی کوشش کرنے لگا۔

بس بس اتنے ہی کافی ہیں! میں نے اسے منع کر دیا اور پوچھنے لگی۔

اچھا یہ بتاؤ جب فالسوں کا موسم ختم ہو جائے گا تو کیا بیچو گے؟ پھر کیا کرو گے؟ اللہ ہمیں روزی دینے والا ہے جی۔ دیکھیں نا فالسہ گیا تو شہتوت' جامن آم اور دوسرے پھل چلنا شروع ہو جائیں گے۔ ہمارا کیا ہے کچھ بھی چھابڑی میں لگا لیں گے۔ اصل سہارا تو ہماری یہ چھابڑی ہے جی۔ جب یہ ہماری ماں ہے ہمیں پالتی ہے تو اسے خالی تو نہیں رکھیں گے نا! اس نے بڑے فخر سے اپنی کھچڑی سی

سائیکل پر مضبوطی سے ٹکی چھابڑی کو ڈھیرے سے ٹھوکا دیا اور فالسوں پر ہرے خوشنما پتے سجانا شروع کر دیئے۔ اسی لمحے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے یہ پوری دھرتی ایک وسیع و عریض چھابڑی ہے جو کسی نہ کسی طریقے اور رنگ میں ہمیشہ سے ہم سب کا پیٹ پالتی چلی آئی ہے۔ اس نے کبھی ہمیں مایوس نہیں کیا۔

دن بھر میں کتنا کما لیتے ہو تم؟

بس جی پچاس ساٹھ تو بچ ہی جاتے ہیں۔ دال روٹی مل جاتی ہے شکر ہے اس باری تعالیٰ کی ذات کا جی۔ گھر میں سات جی ہیں کھانے والے اور میں اکیلا کماؤ پوت ہوں اپنے گھر والوں کا!

وہ فخریہ انداز میں بولتا چلا گیا۔ اور میں سوچنے لگی کاش یہ بچہ اس وقت سکول میں بائرن اور کیٹس کی شاعری کا تنقیدی جائزہ پڑھ رہا ہوتا۔ شام کو ہونے والے انٹر کالجیٹ ٹینس ٹورنامنٹ کی تیاری کر رہا ہوتا یا گرمیوں کی چھٹیوں میں اپنے والدین کے ساتھ ورلڈ ٹور پر جانے کے پلان بنا رہا ہوتا۔ میں نے اسے پیسے دیئے اور ایک ٹھنڈی آہ بھر کر اپنی گاڑی کی طرف چل دی۔

یکا یک میرا دل زور سے دھڑکا۔ اسے پتہ نہیں چل سکا تھا لیکن میں نے دیکھ لیا تھا کہ جس پارک شدہ گاڑی کے پچھلے حصے سے وہ ٹیک لگائے کھڑا تھا وہ گاڑی ہلنا شروع ہو چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ فالسہ فروش کو گاڑی کے ریورس کئے جانے کا علم ہوتا' گاڑی اسے ایک جھٹکے سے نیچے گرا چکی تھی۔ ایک معصوم محنت کش کے یوں گاڑی کے نیچے کچلے جانے کے خوف سے میں بجلی کی سی تیزی سے اس کی طرف لپکی اور اسے گھسیٹ کر پرے کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ فالسے والے کے سر کے گرد لپٹا صافہ کھل کر اس کی سائیکل کے گرد لپٹ گیا۔ مگر نہ جانے کس طرح گرتے گرتے بھی اس نے ایک ہاتھ اپنی سائیکل پر جمائے رکھا اور وہ کھڑی کی کھڑی رہی' گری نہیں۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ مجھے کچھ سوچنے سمجھنے کی مہلت نہ ملی۔ میں ٹھہری ازل کی ڈرپوک' دل دھک دھک کرنے لگا' ہتھیلیاں پسینے سے تر ہو گئیں۔ دل ہی دل میں شکر ادا کیا کہ وہ بچ گیا۔ یہ سوچ کر دل کو ہول آنے لگے کہ غریب محنت کش بچہ اگر کچلا جاتا تو اس کے گھر والوں کا کیا ہوتا۔

وہ کپڑے جھاڑتا' مسکراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

ذرا گاڑی دیکھ کر ریورس کیا کریں! ابھی فالسے والے کو نیچے دینے لگی تھیں! گاڑی سٹارٹ کرنے سے پہلے کم از کم ہارن ہی دے دیا ہوتا۔

میں نے گاڑی چلانے والی سے' ذرا نا گواری سے کہا۔

قصوران لوگوں کا ہے۔اس طرح گاڑیوں کے پیچھے ٹیک لگا کر سودا بیچنا کہاں کی شرافت ہے بہر حال میں نے سے دیکھا ہی نہیں۔ویسے بھی ان لوگوں میں کوئی سینس نہیں ہوتی۔وہ اپنی صفائی میں بولنے لگی۔

تم ٹھیک تو ہو نا بیٹا۔

ہاں جی بالکل فس کلاس کچھ بھی تو نہیں ہوا!وہ بے فکری سے بولا۔

کس قدر مشکل سے اس کی جان بچی تھی مگر وہ یوں پرسکون تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

دیکھو بیٹا گھر جا کر کوئی صدقہ وغیرہ دے دینا۔اللہ تعالی نے آج بچت کر دی ہائے اگر خدانخواستہ... میں نے جملہ آدھا چھوڑ دیا۔

ہاں باجی جی!صدقہ تو ضرور دوں گا۔میری چھابڑی بچ گئی ورنہ نجانے کیا سے کیا ہو جاتا۔

وہ سائیکل پر اپنی چھابڑی کو بڑے پیار سے سیٹ کر کے پیڈل مارتا' ٹھنڈے میٹھے فالسے کی صدا لگاتا چل دیا۔



مردوں والا کام

مسئلہ یہ تھا کہ حمیداں کا کیا کیا جائے؟

اگر حمیداں کا مسئلہ حل ہو جاتا تو شیرے اور اس کی ماں کو ان کے من کی مراد مل سکتی تھی۔ مگر اتنے سالوں کا لگا ہوا بوٹا ایک دم اپنی جگہ سے ہلا دینا کوئی اتنا آسان کام تو نہیں ہوتا۔

اماں تو چاہتی تھی اس بوٹے کو شیرا' جڑ سے ہی اکھاڑ پھینکے' مگر شیرے کے دل میں ابھی بھی کچھ خدا خوف موجود تھا۔ آخر اس نے حمیداں کے ساتھ اتنے سال گزارے تھے۔ وہ خود پر حمیداں کی ذمہ داری کو محسوس کرتا تھا۔ مگر اس دل کا کیا کرتا جواب اس کے کہنے میں نہیں رہا تھا اور بری طرح تاجی کا دیوانہ ہو چکا تھا۔

اب وہ تاجی کے بغیر ایک پل بھی رہنے کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔ تاجی نہ صرف اس کے جسم و جاں بلکہ اس کے حواس پر بھی بری طرح غلبہ پا چکی تھی۔ اس کے اعصاب پر اس طرح سوار ہو چکی تھی کہ اسے تاجی کے سوا اب کچھ نہیں سوجھتا تھا۔

وہ کرتا بھی کیا؟ تاجی تھی ہی اتنی پرکشش کہ جو ایک بار اس کی تر و تازہ' بھرپور جوانی اور سرخ و سفید چہرے پر نظر ڈال لیتا' اس کے لیے اس کے سحر سے بچنا مشکل ہو جاتا۔

حمیداں نے شیرے کے اردگرد اپنے پیار کا ایک مضبوط حصار اور تحفظ کا تمبو کھینچ رکھا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ ایک روز ایک جلتا ہوا تیر کسی ان دیکھی اور سے آئے گا اور اس تنے ہوئے تمبو میں یوں چھید کر کے رکھ دے گا کہ اس کے بعد وہ پل بھر میں جل کر خاک ہو جائے گا اور بھانبڑ اس کا مقدر بن کر رہ جائیں گے۔

شیرا ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر گھر میں داخل ہوا۔ حمیداں' روز کی طرح صحن کے داہنے طرف بنے مٹی کے چولہے کے آگے بیٹھی کھانا پکا رہی تھی۔ روز کی طرح اپلوں اور لکڑیوں کو پھونکنی سے پھونکیں مارتے ہوئے اس کی چاندی کی بڑی بڑی بالیاں زور زور سے ہلارے کھا رہی تھیں اور آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔

اتنے سال ہو گئے تھے مگر حمیداں کو ابھی تک صحیح طور سے چولہا پھونکنا نہیں آیا تھا۔ کم از کم اماں کا تو یہی خیال تھا کہ وہ نکمی تھی

ورنہ عورت ذات کے لیے یہ کونسی مشکل بات تھی۔ یہ تو بڑا معمولی سا کام تھا۔

اماں کو ویسے بھی حمیداں کو بات بے بات طعنے دینے کی عادت پڑی ہوئی تھی۔ اس کے خلاف شکایت کا کوئی موقعہ وہ ہاتھ سے نہ جانے دیتی تھی۔ بات دراصل یہ تھی کہ حمیداں دراصل اس کی نہیں بلکہ صرف اور صرف اس کے بیٹے شیرے کی پسند تھی۔ اب بیٹا بہو کو گھر لے آیا تھا تو چارو نا چار اسے برداشت تو کرنا ہی تھا مگر ہر وقت جو غم اماں کو اندر ہی اندر کھائے چلا جا رہا تھا وہ یہ تھا کہ حمیداں کی گود ابھی تک خالی تھی۔

یہ کوئی ایسا معمولی جرم نہیں تھا کہ اماں اسے اتنی آسانی سے بھلا بیٹھتی اٹھتے بیٹھتے حمیداں کو سناتی رہتی کہ اس کی وجہ سے ہی وہ اب تک پوتے کی شکل دیکھنے سے محروم تھی۔

جن حالات میں شیرے نے حمیداں سے بیاہ کیا تھا وہ بھی کچھ ایسے نہیں تھے کہ اماں جن پر خوش ہوتی۔ غضب خدا کا' ایک کنوارہ' چاند جیسے مکھڑے والا لڑکا اور ایک بیوہ عورت جس نے خاوند کے مرنے کے بعد ایک مردہ بچے کو جنم دیا ہو' کا آپس میں کیا جوڑ؟

مگر شیرے کی تو شاید مت ہی ماری گئی تھی آگا دیکھا نہ پیچھا بس ضد پکڑ لی کہ حمیداں سے شادی کروں گا تو جیوں گا۔

ورنہ تمام عمر کنوارہ رہوں گا۔

حمیداں نے کھنکا سن کر اوپر سے اٹھایا۔ اس کے کان کے بالے زور زور سے دھڑک اٹھے اور اس کی گردن سے لپٹنے کی کوشش کرنے لگے۔

آ گیا شیرے! وہ مسکرائی۔

روٹی ملے گی؟ وہ روز کی طرح اس سے مخاطب ہوا اور ہاتھ منہ دھونے لگا۔

حمیداں اس کے لیے گرم گرم روٹی توے پر ڈالنے لگی۔

شیرا چپ چاپ روٹی کھانے لگا اور حمیداں اس کے پاس بیٹھ کر اسے کھاتا دیکھ کر خوش ہونے لگی مگر سوچنے لگی اب نہ جانے وہ چپ چپ کیوں رہنے لگا تھا۔ پہلے پہل تو وہ اس کے پاس بیٹھا ہوتا تو ایک لمحے کو بھی خاموش نہ ہوتا تھا۔

دن بھر کے چھوٹے موٹے واقعات' کھیتوں پر کام کی روداد سناتا اور ہنسی مذاق کرتا رہتا تھا۔ گرما گرم پکتی ہوئی روٹی کی مہک اور حمیداں کے پنڈے کی باس کو اپنے اتنے قریب محسوس کرتا اور سوچتا کہ کونسی زیادہ مدہوش کن ہے تو فیصلہ نہ کر پاتا اور جلدی جلدی

لقمے نگلنے کے لیے پانی پینے لگ جاتا۔

حمیداں' لکڑیوں سے اٹھتے دھوئیں سے' گلابی ہوتی آنکھوں کو ملنے لگتی تو لاڈ سے پوچھنے لگتا۔

دھواں لگتا ہے میری رانی کو؟

ہاں! سچی بڑی مرچیں لگتی ہیں! وہ منہ بسورتی۔

ارے ارے! میری رانی کی اتنی خوبصورت آنکھیں ہیں! اتنی خوبصورت جیسے گندم کے سنہری خوشے ہوں! وہ اس کی بھوری بادامی آنکھوں کی تعریفیں کرنے لگ جاتا۔

قسم اللہ کی ان آنکھوں کو تکتے تکتے ہی تو میری صبح شام بسر ہوتی ہے۔ یہ تو ہر لمحے میرے ساتھ رہتی ہیں۔ انہی کو دیکھ لوں تو مجھے پتہ چل جاتا ہے کہ یہ کونسا سمے ہے!

کیا! کیا الٹی سیدھی باتیں کرتا ہے تو! وہ ہنس پڑتی۔

سچ حمیداں! تجھے نہیں پتہ' تیری آنکھوں میں کیا جادو ہے۔ بھور سمے' ان میں آنے والے اچھے دن کی امید کا' روپہلا سورج طلوع ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ پھر جوں جوں دن چڑھتا چلا جاتا ہے تیری آنکھوں میں سکھ اور شانتی کا سندیسہ چمکنے لگتا ہے۔

شام آتی ہے تو چپکے سے تیرے آنکھوں میں کجرا بن کر پھیل جاتی ہے اور جب رات آتی ہے نا.... تو ان میں ملن جوت یوں جل اٹھتی ہے کہ یہ دو آنکھیں بلدے دیوے بن جاتے ہیں۔ ایسے بلدے دیوے جن کی ٹمٹماہٹ میں مسافر راستہ تو بھول سکتا ہے مگر بھٹک نہیں سکتا' کیونکہ سارے رستے تیری ہی طرف تو آتے ہیں۔ تو ہے تو میں ہوں! تو نہیں تو میں کچھ بھی نہیں!

وہ سنجیدہ ہو کر اسے ٹکر ٹکر دیکھنے لگ جاتی تو وہ یکدم کھلکھلا اٹھتا۔

ارے! تو تو جھلی ہے جھلی! اگر دو چار جماعتیں پڑھ رکھی ہوتیں نا' تو سب سمجھ جاتی کہ میں کیا کہہ رہا ہوں!

وہ اپنے دس جماعتیں پاس ہونے کی برتری جتانے لگ جاتا۔

شیرا اس کی کل حیاتی تھا۔ وہ اس سے اتنا پیار کرتا تھا کہ وہ اپنی قسمت پر جتنا ناز کرتی کم تھا۔ کبھی کبھی جب وہ اسے کہتا۔

دیکھ حمیداں کہیں یہ نہ ہو کہ تجھ سے میرا پیار سنبھالا نہ جائے تو وہ ڈر جاتی۔

وہ تو شیرے سے محبت کرنے کے علاوہ اس کی بہت احسان مند بھی تھی جس نے حمیداں جیسی لڑکی کو اپنا جیون ساتھی بنا لیا تھا۔ ورنہ وہ تو اپنی بنجر زندگی کو قسمت کا لکھا سمجھ کر چپ چاپ قبول کر کے جئے چلی جا رہی تھی۔ اس کی زندگی بے مقصد' بے مصرف اور اجاڑ

بیابان تھی۔ سسرال میں بھی اب اس کی کوئی عزت‘ کوئی وقعت نہ رہی تھی مگر وہ ان ہی کے ہاں رہنے پر مجبور تھی کیونکہ اس کے میکے میں سوائے ماں باپ کے کوئی تھا نہیں اور وہ دونوں بھی عرصہ ہوا مر چکے تھے۔

شوہر کی موت کے تین سال بعد تک سسرال کی دلیز پر پڑے پڑے وہ خود بھی لکڑی کا بے جان‘ کھردرا تختہ بن کر رہ گئی تھی۔

اپنی بڑی بڑی ویران آنکھیں کھولے وہ ٹکر ٹکر زندگی کو اپنے قریب سے ہو کر گزرتے دیکھتی رہی اور سوچتی رہی یہ ظالم زندگی کبھی پل بھر کو رک کر مجھ پر بھی ایک نظر کیوں نہیں ڈال لیتی؟

گھر کا کام کاج کر کے وقت گزار لیتی۔ سبزی کاٹتی تو سبزی کی جگہ اپنے حیات سے عاری جسم کو کاٹ رہی ہوتی۔ ہنڈیا پکاتی تو خود کو چولہے میں جھونک‘ اپنی روح کو دیگچی میں ڈال کر بھوننے لگ جاتی۔ کپڑے دھوتی تو اپنے ہی وجود کو بیگانگی کے ڈنڈے سے کوٹ پیٹ کر تیز جلتی دھوپ میں سوکھنے کے لیے ڈال دیتی۔ جھاڑو لگاتی تو اسے اپنی ذات ہزاروں ٹکڑوں میں ریزہ ریزہ بکھری کوڑے کرکٹ میں پڑی ملتی۔

اس نے تو اندھیرے کا چولا پہن کر بیراگن کی کھڑاویں پاؤں میں ڈال لی تھیں کہ ایک روز ایک نئی نکور صبح نے اس کے دروازے پر دستک دی اور اسے چونکا دیا۔

اس چمکیلی صبح کے سورج کا نام شیرا تھا۔

اس سورج کی چکا چوند سے آنکھیں خیرہ ہوتیں تھیں۔ یکدم چاروں طرف اجالا پھیلا اور حمیداں کی آنکھوں میں نور ہی نور بھر گیا۔

حمیداں کو خبر بھی نہ ہوئی کہ اس نے کب اور کس طرح اس روپہلے سورج کو اپنی ہتھیلیوں پر سجا کر اس کی افشاں چہرے پر مل لی اور چاندی کے رتھ پہ جا سوار ہوئی۔

شیرے کو بھی وہ دن اچھی طرح یاد تھا جب اس نے پہلی بار حمیداں کو اپنے دوست افضل کے گھر میں دیکھا تھا۔ وہ افضل کی بھابی تھی‘ یہ تو سب کو معلوم تھا مگر اس زرد گلاب کی نازک افسردہ سی ٹہنی میں کہیں زندگی کی حسرت بھی موجود ہو سکتی ہے‘ یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔

شیرے نے بیس بائیس برس کی نازک اندام سوگوار سی لڑکی دیکھی تو اس کی بڑی بڑی بھوری آنکھوں کے آسیب میں پھنسا‘ خود کو بے بس سا محسوس کرنے لگا۔

اس نے کسی نہ کسی بہانے سے افضل کے گھر آنا جانا شروع کر دیا‘ اور سب گھر والوں سے گھل مل گیا۔ حمیداں کبھی چائے لے کر

کبھی کھانا لے کر پاس چلی آتی تو وہ گم صم سا اسے تکنے لگتا اور تکے چلا جاتا۔

اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ حمیداں ایک لٹی پٹی عورت تھی اور طوفانوں میں سے گزر کے آتی تھی یا اس کی سماجی حیثیت کیا تھی۔ اسے تو بس ایک ہی بات کا پتہ تھا کہ حمیداں اسے اچھی لگتی تھی اور بس۔

آہستہ آہستہ دونوں کی نظریں ایک دوسرے سے کچھ کہنے اور سننے لگیں اور حمیداں نہ چاہتے ہوئے بھی ریشمی رنگ دار خوابوں میں کھوئی رہنے لگی۔

بہت سوچ بچار کے بعد شیرے نے جب اماں کو حمیداں کی سسرال اس کا رشتہ مانگنے کے لیے جانے کو کہا تو حسب توقع اماں نے طوفان سر پر اٹھا لیا۔ اس کے تو وہم وگمان میں بھی یہ نہ تھا کہ اس کا اکلوتا کنوارہ بیٹا ایک رانڈ ایک مردہ بچے کی ماں پر مرمٹا تھا۔

ضرور اس کٹنی نے کوئی جادو تعویذ کیا ہوگا! میرا چن پتر بھولا بھالا ہے۔ میں ان عورتوں کے چالے اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ غضب خدا کا ایک کھسم اور ایک بچہ کھا کر چین نہیں ملا ڈائن کو جواب میرا گھر دیکھ لیا۔ میں ہرگز اس کا رشتہ مانگنے نہیں جاؤں گی!

اماں نے سینہ کوٹ لیا اور دہائیاں دینے لگی۔ محلے داروں کو خبر ہوگئی' رشتہ داروں کو پتہ چل گیا۔

زور کی آندھی چلی۔ بات حمیداں کے سسرال تک بھی پہنچ گئی۔

ہماری بہو! ہمارے خاندان کی عزت! ہمارے مردہ بیٹے کی نام لیوا اور دوسری شادی! یہ کیسے ممکن ہے۔

اس کا سسر گرجنے لگا اور ساس نے لاتیں توڑ کر اندر ڈال دینے کی ایسی دھمکی دی کہ حمیداں کا سانس رک رک کر آنے لگا اور وہ دوبارہ سے زرد گلاب کی کمزور سی ٹہنی بن گئی۔

چھوٹے چھوٹے رنگین سپنے جو اب اس کے قریبی دوست بن چکے تھے اس نے مجبوری کے بڑے سے آہنی صندوق میں بند کر کے اوپر احتیاط کا قفل لگا دیا اور سر میں تنہائی کی راکھ انڈیل لی۔ دونوں طرف سے رشتہ داروں نے تلواریں نکالیں۔ لعن طعن کا مینہ برسنے لگا اور کیچڑ اچھلنا شروع ہوگیا۔ شیرا ناامید سا ہوگیا مگر حمیداں کو بھلا دینا اس کے بس سے باہر تھا۔

ایک شام اس کے دوست اچھو پہلوان نے اسے اداس' پریشان دیکھ کر اسے کریدا۔ شیرے نے اپنی الجھن بتائی اور یہ بھی کہ وہ حمیداں کے بغیر زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

شیرے کی بات سنتے ہی اچھو کو تو جیسے ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ وہ اتنی زور زور سے ہنس رہا تھا کہ اسے مالش کرنے والے لڑکے کے ہاتھ سے تیل کی بوتل چھوٹ کر دور جا گری۔

اوئے جا اوئے میرے مٹی کے شیرا۔ مجنوں بن گیا مگر شیر نہ بننا آیا اس میں ایسا کیا مسئلہ ہے!
تو کیا کروں یار! اماں نہیں مانتی نا! اوپر سے اس کے سسرال والوں نے بھی فساد کھڑا کر رکھا ہے۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔
تو کیا ہوا یار؟ ڈرتا کیوں ہے؟ کب تک چوڑیاں پہن کر بیٹھا رہے گا تو! آخر مرد ہے! کوئی مردوں والا کام کر... اٹھا کے لے جا اسے اور کر لے ویاہ.... یہاں لے آ میرے اکھاڑے پر! میں پڑھواؤں گا تیرا نکاح اس سے... اچھو پہلوان تیرے ساتھ ہو گا تو کس مائی کے لال میں اتنی طاقت ہے کہ تجھے روک سکے! بس تو فکر نہ کر...
اچھو نے اسے حوصلہ دلایا تو شیرے کے دل میں بھی ہمت پیدا ہونے لگی۔ واقعی یہ کوئی اتنا مشکل کام تو نہیں تھا۔ اتنی ناممکن بات تو نہ تھی۔
وہ کسی مناسب موقع کی تاک میں رہنے لگا۔ ایک صبح منہ اندھیرے گھات لگائے بیٹھا تھا کہ حمیداں اپنی نند کے ساتھ کھیتوں کی طرف جاتی دکھائی دی۔
شیرے نے گھوڑی سرپٹ دوڑا دی اور نپے تلے قدموں سے چلتی دونوں لڑکیوں میں سے اپنی دلہن کو اچک لیا۔ دوسری لڑکی کی چیخیں دیر تک سنائی دیتی رہیں اور حمیداں کے دل کی دھڑکن تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی' مگر گھوڑی کی ٹاپوں کی آواز میں دب کر رہ گئی۔
اچھو پہلوان نے جلدی جلدی مولوی اور گواہوں کو بلایا۔ حمیداں کو تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ شاید کوئی خواب تھا۔ لیکن اتنا' میٹھا تو اس کا کوئی خواب اب تک ثابت نہ ہوا تھا۔ اس نے آنکھیں میچے میچے ہی ہاں کر دی اور مبارک سلامت کا شور مچ گیا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر اس نے آنکھ کھول دی تو اس سندر سپنے کی مالا کے موتی ٹوٹ کر بکھر جائیں گے اور وہ پھر سے تہی دامن ہو جائے گی۔
نکاح کی خبر سنتے ہی رشتہ داروں نے پھر تلواریں میان سے نکال لیں۔ پھر سے فساد مچا لیکن اب چونکہ کچھ ہو نہ سکتا تھا اس لیے مصلحت کے تحت سب نے خاموشی اختیار کر لی۔ اور قصہ کچھ عرصے کے بعد دب گیا۔
حمیداں شیرے کی بیوی بن کر اپنے نصیبے پر اترائی اترائی' چڑیا کی طرح پھدکتی پھرتی۔ اس نے نئے سرے سے ہنسنا بولنا سیکھا اور اپنے سر پر شیرے کے پیار کی دھانی چنریا ڈالے خود کو دنیا بھر کے غم' فکر' ڈر خوف سے محفوظ سمجھنے لگی۔
شیرے جیسے جی دار مرد کی والہانہ محبت نے حمیداں جیسی کمزور لڑکی کو ایک مضبوط عورت بنا دیا اس لیے اب اسے زمانے کا کوئی ڈر نہیں تھا' نہ ہی ساس کی جلی کٹی باتوں کی کوئی پرواہ تھی۔ اسے اپنے مرد کی محبت پر ایسا مان تھا کہ اس مان نے اس میں ایک نئی آب و

تاب پیدا کردی تھی۔ وہ ہر وقت چاندی کے جھمکوں کی طرح جھم جھم کرتی نظر آنے لگی۔ اور لڑکیاں اس کے نصیبے پر رشک کرنے لگیں۔ وقت گزرتا گیا۔

وقت کے ساتھ ساتھ حمیداں کا شیرے سے پیار بڑھتا چلا گیا اور شیرے کا پیار ٹھہرے پانی کی طرح ساکن ہو گیا۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ ساکن پانی میں کنکر پھینک کر دائرے بنا ڈالنے والا کوئی ننھا سا ہاتھ ابھی تک ان کی چھوٹی سی دنیا سے کہیں بہت دور رہتا تھا۔ نہ جانے کس دیس میں اس کا بسیرا تھا؟ نہ جانے وہ ان کے آنگن میں چاند بن کر کیوں نہیں اتر آتا تھا؟

پانچ سال گزر گئے۔ حمیداں اداس رہنے لگی اور شیرا اس موضوع پر خاموش ہو کر رہ گیا۔ اماں کو لیکن خاموش رہنے کی کیا ضرورت تھی۔ اٹھتے بیٹھتے ٹھنڈی سانسیں بھرتی' طعنے مارتی اور باتیں سناتی تھی۔ حمیداں کا کلیجہ چھلنی ہو جاتا لیکن منہ سے ایک لفظ نہ نکالتی۔

اماں کہتی تو حکیموں' پیروں' فقیروں کے ڈیروں پر' بزرگوں کے مزاروں پر اس کے ساتھ چل دیتی مگر اللہ کی شاید ابھی مرضی نہیں تھی کیونکہ ان کی مراد بر نہ آتی تھی۔

اب تو رشتہ داروں' آس پاس' پڑوس کے لوگوں نے بھی انگلیاں اٹھانی شروع کر دی تھیں۔

بھئی بڑا حوصلہ ہے سرداراں کا' بے پھل کے پیڑ کو گھر میں جڑ لگانے کی اجازت دے رکھی ہے۔ تو بہ میری بہو ہوتی تو چٹیا پکڑ کر نکال باہر کر دیتی۔

میں نہ کہتی تھی یہ منحوس ثابت ہو گی۔ غضب خدا کا' ایک تو پہلے سے رانڈ' پھر مردہ بچے کی ماں اور اب دیکھو بے اولاد ہے مگر کس طرح دندناتی پھرتی ہے۔ ڈھیٹ پن دیکھو نہ شرم نہ حیا!

میرا تو خیال ہے اس میں پہلے ہی سے کوئی نقص ہو گا۔ ورنہ مردہ بچے کو جنم نہ دیتی۔

ہر جانب سے حمیداں پر عتاب نازل ہوتا رہتا تھا لیکن اسے تو جیسے کسی بات کی پرواہ ہی نہیں تھی۔ شیرا اس کی پناہ گاہ تھا' اس کی محبت اس کا طاقت تھی اور ایسی طاقت جس کی پوشیدہ موجودگی کا راز صرف اسے ہی معلوم تھا۔

جب تک سیمسن کے بال سلامت تھے اس کو کوئی بھی زیر نہیں کر سکتا تھا مگر ایک روز سیمسن کو نیند آ گئی اور وہ سو گیا۔ چپکے سے ایک ڈیلائلہ اس کے قریب آئی اور اس کے وہ بال جن کی وجہ سے وہ طاقتور تھا' بڑی بے دردی سے کٹوا ڈالے۔ وہ کمزور اور بے بس ہو کر رہ گیا۔

اس روز گنے کے کھیتوں میں سے گنے توڑ کر بھاگتی ہوئی تاجی شیرے سے یوں آن ٹکرائی کہ شیرے کا سارا ضبط' اصول' دھرم وفاداریاں دھڑام سے نیچے گر گئیں۔ آسمانی بجلی کا کوندا سا لپکا اور ایک نئے' کنوارے نوجوان لمس کی گرمی نے شیرے کو پل بھر میں بھسم کر کے رکھ دیا۔

اس روز پہلی بار اسے حمیداں کی گود ٹھنڈی' باسی اور پرانی سی محسوس ہوئی اور وہ ڈر گیا۔ اس میں یہ تبدیلی کیونکر پیدا ہوئی تھی؟ اسے تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ حیران پریشان ہو کر سوچنے لگا... میں تو سمجھ رہا تھا میں اپنی منزل پر پہنچ چکا ہوں مگر یہ کونسی نئی منزل ہے جس کا پتہ تاجی مجھے دے گئی ہے؟

تاجی پکے ہوئے سنہرے گنے کی طرح اوپر سے سخت مگر اندر سے رس بھری تھی۔ شیرے نے بے اختیار ہو کر گنے کو ذرا سا ہاتھ لگا دیا تو اس کے ہاتھ چپچپانے لگے۔

اس نے رس بھرے گنے پر اپنے ہونٹ رکھے تو اس کی تر و تازہ مٹھاس' اس کے ہونٹوں کے ذریعے اس کے خون میں شامل ہوتی محسوس ہونے لگی۔ کیسی آگ بھری مٹھاس تھی وہ کہ شیرے کو اپنے آپ پر کوئی بس نہ رہا اور اس نے چپ چاپ اپنے آپ کو اس آگ کے شعلوں کے حوالے کر دیا۔

اسے تاجی سے ملنے پر کوئی اختیار نہ رہا تھا۔ وہ روز ہی اسے گنے کے کھیت میں منتظر ملتی مگر رس پینے نہ دیتی۔ جتنا جتنا وہ چکھتا اتنی ہی پیاس بڑھتی چلی جاتی۔

گھر آتا تو لکڑیوں اور اپلوں کو پھونکیں مارتی حمیداں کچھ غیر غیر سی لگتی۔ اس کی چولہے میں سلگتی آنکھیں اسے وہ تپش نہ پہنچا تیں جو پہلے پہنچایا کرتی تھیں وہ جلدی جلدی کھانا کھا کر اندر جا کر لیٹ جاتا۔ کروٹ لیتا تو تاجی کو اپنے پہلو میں پاتا اور آنکھیں موند کر سوتا بن جاتا۔

گنے کے کھیت نے اسے روک لیا تھا۔ اب وہ گھر بھی کچھ دیر سے آنے لگا تھا۔ گاؤں میں چہ میگوئیاں شروع ہونے لگیں تو بات اماں تک بھی پہنچ گئی۔ تاجی حمیداں کی طرح ڈرپوک لڑکی نہیں تھی۔ وہ تو شیرے اور اپنی ملاقاتوں کا حال بڑے فخریہ انداز میں اپنی سہیلیوں کو بتاتی اور کدکڑے لگاتی پھرتی تھی۔

اماں نے پوچھا تو شیرے نے خاموشی سے سر جھکا لیا اماں نے اس کی آنکھوں میں چھپی نئی محبت اور اسے پا لینے کی نئی حسرت کو بہ آسانی پڑھ لیا۔

اماں کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اس کے دل میں تو فوراً امید کے دیئے جھلملانے لگے۔ ننھے منے گلابی رنگت کے پوتے کو کھلانے کے' خوبصورت جھلمل کرتے جہیز کے' نئی نکور کنواری ان چھوئی بہولانے کے خوابوں سے اس کی بوڑھی آنکھوں میں نئی روشنی پیدا ہونے لگی اور وہ سوچنے لگی۔

پہلی بار تو شیرے نے دھکے زوری' زبردستی سے' ایک بھونڈے انداز سے اپنا بیاہ رچا لیا تھا' اب کی بار میں خود اپنے ہاتھوں سے اپنے بیٹے کو سہرا باندھوں گی۔ ساری برادری کو کھانا کھلاؤں گی۔ لال جوڑا پہن کر خود بھی سب عورتوں کے سنگ ناچوں گی... اپنے سارے ارمان پورے کروں گی.... مگر مسئلہ یہ تھا کہ حمیداں کا کیا ہوگا؟

دونوں ماں بیٹا دن رات اسی سوچ میں گھرے رہتے کہ حمیداں کا کیا کیا جائے؟

تاجی نے بھی آہستہ آہستہ بہانے بہانے ان کے گھر آنا شروع کر دیا اور اماں سے بے تکلف ہوتی چلی گئی۔

لاماسی! میں تیرے سر میں تیل ڈال دوں! دیکھ تو سہی کتنی خشکی ہو گئی ہے۔

لاحمیداں آپا! دال میں سے کوکڑو میں چن دوں!

لاشیرے کی پگ کو مائع دے دوں! اس کے گھوڑے کو میں چارہ ڈال دوں! اس کی واسکٹ کو میں کھونٹے پر لٹکا دوں!

پہلے پہل تو حمیداں کی عقل میں کوئی ایسی بات نہ آئی جس کی وجہ سے وہ تاجی کے آنے پر اعتراض کرتی مگر جب رفتہ رفتہ اس نے یہ محسوس کیا کہ شیرا تاجی کو کچھ زیادہ ہی اپنی توجہ سے نوازنے لگا ہے تو اس نے خوف اور حیرت سے اپنا کلیجہ پکڑ لیا۔

اس کے خواب وخیال میں بھی نہ تھا۔ کہ ڈیلائلہ کب کی سیمسن کے بال کاٹ کر لے جا چکی ہے اور سیمس کا بت کمزور ہو کر فرش پر گر کر پاش پاش ہو چکا ہے۔

یہ کمینی ہرگز اس گھر میں آئندہ نہیں آئے گی! اس نے چیخ کر گھر کی اور شیرے کی مالکہ ہونے کی حیثیت سے اعلان کیا۔

خیر میرے رشتہ داروں کی لڑکی ہے! کیوں نہ مجھے ملنے آئے! اماں نے ڈھیٹ پن سے کہا۔ تاجی اس کی نند کی بیٹی کے سسرالی رشتہ داروں میں سے تھی۔ اماں نے یہی حوالہ دے کر اس کا دماغ کرنا چاہا۔

کیوں آئے گی؟ کیا اسے اس گھر میں میرے جگہ دینے کا ارادہ ہے؟ یاد رکھنا اماں میرے جیتے جی ایسا نہیں ہوگا۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتی۔ وہ شیرنی کی طرح بپھر گئی۔

شیرے! بتا کیوں نہیں دیتا اپنی لاڈو رانی کو! ہاں ہاں میں اپنے سوہنے پت کا اپنی مرضی سے ویاہ کروں گی۔ کوئی دوسرے

آ ئے گی تو مجھے پوتے کی شکل دیکھنا تو نصیب ہو گی نا!

اماں نے منہ پھاڑ کر سب کچھ کہہ دیا۔ شیرے نے حمیداں کی طرف دیکھے بغیر اپنا صافہ اٹھایا اور گھر سے باہر نکل گیا۔

اس کا دل بری طرح گھبرا رہا تھا' وہ تیز تیز دوڑتا ہوا گنے کے کھیت کی طرف جا رہا تھا کہ تاجی راستے میں ہی اسے مل گئی۔

کیا ہوا ہے جی آپ کو؟ رنگ کیوں پیلا پڑا ہوا ہے؟ اور اتنا پسینہ آ رہا ہے ماتھے پر؟

تاجی نے اپنے دوپٹے کے پلو سے شیرے کے ماتھے پر آیا پسینہ صاف کیا اور وہ دونوں وہیں پاس ہی لگے بڑے سے بوڑھ کے درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔

شام گہری ہوتی جا رہی تھی۔ پنکھ پکھیرو تھکے ماندے اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ شیرے نے تھک کر تاجی کے کاندھے پر سر رکھ دیا اور وہ اسے ہولے ہولے تھپتھپانے لگی۔

اس چڑیل نے کچھ کہا ہو گا! آپ اسے صاف صاف بتا کیوں نہیں دیتے؟ تاجی کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

بتایا تھا' کہنے لگی وہ کسی صورت ایسا نہیں ہونے دے گی! اب دیکھ نا تاجی میں اسے گھر سے تو نہیں نکال سکتا نا... کیا کروں؟ مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا؟

پکھیرو نے آشیانے کی طرف مدد کے لیے دیکھا۔

تو پھر ٹھیک ہے! بیٹھا رہ اس ہی کے ساتھ... مگر مجھ کرموں جلی کو کیوں دھوکا دے رہا ہے؟ اگر مجھ سے سچا پیار ہوتا تو مجھے یوں اپنے سے دور نہ رکھتا' عزت سے اپنے گھر لے جاتا۔ تو اتنا بزدل ہے' میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی... کیا تو ہمارے پیار کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا؟ تم سب مردوں کی ذات ہوتی ہی مطلب پرست ہے۔

وہ آنسو بہانے لگی اور شیرے کا سر اپنے کاندھے سے ہٹا دیا۔ پھر اٹھ کر ہچکیاں لیتی اپنے گھر کو چل دی اور شیرا دور تک اسے جاتا دیکھتا رہا۔

تاجی اس کی جان' اس کی زندگی اس سے روٹھ کر جا رہی تھی اور وہ کچھ بھی کر سکنے کے قابل نہ تھا۔ اس کا دل ڈوبنے سا لگا۔ اور وہ مریل مریل قدموں سے اٹھ کر پگڈنڈی پر چلنے لگا۔

حمیداں! گھر میں گھستے ہی وہ شیر کی طرح دھاڑا۔

میں تاجی سے شادی کروں گا اور دنیا کی کوئی طاقت مجھے اب نہیں روک سکتی! شیرے نے پاس پڑی ایک لکڑی اٹھائی اور شعلوں

میں جھونک دی۔

مگر... مگر... تو تو سچ مچ مجھ سے پیار کرتا تھا۔تو تو میرا تھا... الفاظ اس کے گلے میں پھنس گئے۔

پہلے تجھ سے کرتا تھا' اب اس سے کرتا ہوں! اتنی سی بات تیری سمجھ میں نہیں آتی؟ ارے میں کونسا تجھے گھر سے نکال رہا ہوں۔تو بھی یہیں رہ لے۔میری جان کو کیوں آتی ہے؟ میں نے تجھ سے' ساری عمر اپنے ساتھ چپکا کر رکھنے کا وعدہ تو نہیں کیا تھا! تو تو چاہتی ہے ساری عمر ہی مجھ سے چپکی رہے!

حمیداں ہکا بکا ہو کر اسے دیکھتی چلی گئی اور سوچنے لگی' کیا ہواؤں کے دوش پر سانسوں اور دھڑکنوں سے لکھے وعدے کوئی وقعت نہیں رکھتے کیا وعدے صرف وہی ہوتے ہیں جو کاغذوں پر قلم سے لکھ کر کہتے جاتے ہیں

وہ خاموشی سے بیٹھی اپنے خیالوں میں گم نہ جانے ابھی اور کتنی دیر بیٹھی رہتی کہ یکدم شوں کی آواز نے اسے چونکا کر رکھ دیا۔مسر کی دال ابل کر مٹی کی ہانڈی سے باہر کو گر رہی تھی اور آگ ٹھنڈی پڑتی جا رہی تھی۔

ہنڈیا کا دھیان رکھ! کیا بھوکا مار دینے کا ارادہ ہے آج؟ شیرا بڑبڑاتا ہوا اٹھا اور اپنا صافہ سر پر رکھ کر باہر کو چل دیا۔اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ وہ کہاں جاتے۔بے خیالی میں قدم خود بخود اٹھتے چلے جا رہے تھے۔نہ جانے کس طرح وہ آپ ہی آپ اچھو کے اکھاڑے پر جا پہنچا تھا۔اسے تو پتہ بھی نہیں چلا تھا۔

کیا ہوا میرے یار؟ بڑا منہ لٹکایا ہوا ہے تو نے؟ اس کے دوست نے محبت سے پوچھا تو شیرے سے رہا نہ گیا اور سارا ماجرا کہہ سنایا۔

یار حمیداں مسئلہ بنی ہوئی ہے' کیا کروں؟

اچھو پہلوان کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔

یار تو تو بس نام کا ہی شیر نکلا۔اچھو پہلوان کا یار ہو کر ایک زنانی کے ہاتھوں بے بس ہو گیا ہے۔شرم کر یار۔بس اتنی سی بات ہے؟ یہ بھی کوئی مسئلہ ہے جس پر تو اتنا پریشان پھر رہا ہے؟ ٹھیک ہے ایک زنانی سے دل بھر گیا تو نئی لے آ؟ جا یار جا! چوڑیاں پہن رکھی ہیں تو نے تو! جا جا کر کوئی مردوں والا کام کر! جو جی میں آتا ہے کر... اور حوصلہ رکھ! میں جو تیرے ساتھ ہوں!

اس نے شیرے کی پیٹھ ٹھونکی اور شیرے کے دل میں ایک نیا ولولہ اور توانائی پیدا کر دی۔

حمیداں کی دنیا لٹنے والی تھی۔اس نے نئے سرے سے دوا دارو شروع کر دی۔اس نے سنا تھا ساتھ والے گاؤں میں ایک نئے

پیر صاحب آئے ہیں جن کی کرامات کچھ ایسی تھیں کہ ان کا چرچا دور دور تک پھیل چکا تھا۔ سنا تھا کوئی سوالی ان کے در سے خالی ہاتھ نہیں لوٹتا تھا۔

حمیداں کسی نہ کسی طرح پیر صاحب کے آستانے پر جا پہنچی اور جا کر اولاد کے لیے جھولے پھیلا دی۔ پیر صاحب بہت بوڑھے اور پہنچے ہوئے بزرگ تھے۔ انہوں نے حمیداں کی بات غور سے سنی اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ سے خصوصی طور پر دعا کی' پھر اسے دو تعویذ لکھ کر دیئے اور نماز پنجگانہ کی ہدایت کر کے روانہ کر دیا۔

حمیداں کو اندھیرے میں امید کے ننھے ننھے دیئے نظر آنے لگے۔ اس نے پیر صاحب کی ہر ہدایت پر عمل کیا ایک تعویذ اپنے گلے میں ڈال لیا اور دوسرا اپنے آنگن کے درخت پر لٹکا دیا۔ دن گزرتے گئے۔ شیرا اور اماں آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے سوال جواب کرتے مگر حمیداں کے سامنے زیادہ بات چیت نہ کرتے تھے۔ تاجی شاید مستقل طور پر شیرے سے روٹھ چکی تھی۔ کم از کم حمیداں کا تو یہی خیال تھا کیونکہ اب اس نے کبھی ان کے گھر پھیرا نہیں ڈالا تھا۔

چلو بلا ٹل گئی! حمیداں نے دل ہی دل میں اپنے رب کا شکر منایا۔ اور نئے سرے سے اماں اور اپنے شوہر کی خدمت اور دلجوئی میں جت گئی۔

اماں' کچھ دنوں کے لیے' اپنے بھائی سے ملنے اس کے گاؤں چلی گئی۔ اماں کی عادت تھی کچھ عرصے بعد اپنے بہن بھائیوں سے ملنے ضرور چلی جایا کرتی تھی۔ اماں کے جانے کے بعد شیرا مزید چپ چپ رہنے لگا اور سوچوں میں کھو کر رہ گیا۔

حمیداں چاہتی تھی کہ کسی طرح اپنے گھر کے حالات پھر سے ٹھیک کر لے۔ ہر وقت اسی سوچ میں پڑی رہتی تھی کہ ایک روز اچانک' اسے اس کے اپنے وجود نے اسے ایک خوشی کی نوید دی۔ یہ وہ نوید تھی جس کی آرزو میں وہ کب سے سلگ رہی تھی۔

اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ واقعی اس کے اپنے وجود سے ایک پھول کھلنے والا' ایک نغمہ بار آبشار پھوٹنے والی ہے۔ وہ باؤلی سی ہو کر اپنی رشتے کی ایک چاچی' سکینہ کے پاس دوڑی جا پہنچی۔ چاچی نے اچھی طرح پوچھ تاچھ کر کے اسے مبارکباد دی اور اسی وقت سوا روپے کی نیاز مسجد میں بھجوا دی۔ گھر لوٹتے ہوئے حمیداں کے قدم من من بھر کے ہو گئے تھے۔ اس سے چلا ہی نہیں جا رہا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ ہوا کے دوش پر دھیرے دھیرے اڑتی ہوئی اپنے گھر جا پہنچے۔ ڈرتی تھی' کہیں تیز تیز قدموں سے چلنے سے' اندر پھوٹنے والے غنچے کو کوئی ٹھیس نہ پہنچ جائے۔ وہ گھبرا کر سوچنے لگی۔ نہ جانے میں اب اس کا خیال کس طرح رکھ سکوں گی؟ آخر وہ اتنا نازک سا ہوگا۔ کیا کروں گی میں؟

انہی سوچوں میں ڈوبی' وہ نئی نکور دلہن کی طرح شرماتی' لجاتی اپنے گھر کی جانب چل دی۔ راستے میں پڑنے والے گندم کے سبز

سے کھیت پر بیٹھی لاتعداد چڑیاں اس کے پاس پہنچنے پر ایک دم سے اسے کانوں میں مبارکباد کہہ کر پھر سے اڑ گئیں۔

شریر کہیں کی! اس نے دل ہی دل میں ان کی اس ادا پر انہیں پیار سے ڈانٹ دیا۔

جا جلدی سے گھر لوٹ جا! گندم کے خوشوں میں چھپی اس کی اپنی آنکھیں اسے پیار سے تکتے ہوئے بولیں۔

اب تو شیرے کو نئی عورت لانے کی کوئی ضرورت نہیں رہے گی!

ہوا کے ایک تیز جھونکے نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ حمیداں خوشی خوشی چلتی چلی گئی۔

شام کو حسب معمول جب شیرا گھر میں داخل ہوا تو یہ دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں کہ سارے گھر کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔

ہر چیز صاف ستھری اجلی اور نئی نئی لگ رہی تھی۔ میز پر صاف میز پوش' بستر پر صاف چادریں' صحن میں مٹی کا نیا لیپ' حتیٰ کہ گلدان میں پلاسٹک کے پرانے میلے پھولوں کی جگہ بھی نئے تر و تازہ گلاب جگمگا کر اسے اپنی طرف متوجہ کر رہے تھے۔

اماں چونکہ موجود نہیں تھی اس لیے گھر میں سے اس کے مستقل بولتے رہنے کی آوازیں نہیں آ رہی تھیں۔ مگر بجائے سونا سونا اور خالی خالی لگنے کے' سارا گھر حمیداں سے بھرا ہوا تھا۔

کروشیئے کی جھالر سے سجے شیلف پر رکھے ہوئے ٹیپ ریکارڈ پر شیرے کی پسندیدہ' نور جہاں کے پنجابی گانوں کی کیسٹ لگی ہوئی تھی۔ شیرے نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے حمیداں کی طرف دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس پر تو ایک عجیب سا نکھار آیا ہوا تھا۔ وہ اپنی شادی کے دن والا لال جوڑا پہنے ہوئی تھی۔ اس نے ایک عرصے سے سونے کا زیور اپنے تن سے نہیں لگایا تھا۔

لیکن آج سونے کا زیور جو پہنا تھا تو اس زور سے چھب رہا تھا۔ کہ قیمتی لگنے لگا تھا۔

ہر شام کی طرح اس شام بھی وہ زمین پر چوکی پر بیٹھی کھانا پکا رہی تھی۔ صحن' مصالحے اور تازہ پکنے والی روٹی کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔

کھٹکا سنتے ہی حمیداں نے سر اٹھا کر شیرے کی طرف دیکھنے کے بجائے پھونکنی سے زور زور سے جلتی ہوئی لکڑیوں کو پھونکیں مارنا شروع کر دیں اس روز اسے اپنی آنکھوں سے بہنے والے پانی کی بھی کوئی پرواہ نہیں تھی۔

حمیداں! شیرے نے اسے ہولے سے پکارا۔

حمیداں نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ پلکوں کی جھالر ذرا سی پیچھے کو ہٹی تو شیرے کو دو بلدے دیوے انتظار اور چاہت کا ایک پورا جہان سمیٹے نظر آئے۔ ایسا سپنوں بھرا کاجل تو ان آنکھوں نے پہلے کبھی نہیں لگایا تھا۔ ایسی بے قراری کی لالی تو ان

گالوں پر شفق بن کر پہلے کبھی نہیں پھوٹی تھی۔ ایسی سرخی تو ہونٹوں کے ان غنچوں کا مقدر پہلے کبھی نہیں بنی تھی۔

شیرا چوکی کھینچ کر حمیداں کے پاس بیٹھ گیا۔ تپش کے اتنے قریب آ جانے سے حمیداں کا چہرہ مزید تمتمانے اور جسم کانپنے لگ گیا۔

کتنے برس ہو گئے تجھے لکڑیوں اور اپلوں کے دھوئیں سے اپنی یہ خوبصورت آنکھیں خراب کرتے ہوئے۔ جب تو بیاہ کر آئی تھی تو تیری یہ دو آنکھیں گلاب کے غنچوں کی مانند ہر دم کھلی رہتی تھیں۔ اب تو ان کا ناس ہو کر رہ گیا ہے۔ ہر وقت لال رہتی ہیں یہ!

اس نے پیار سے حمیداں کے ماتھے پہ آئی ایک لٹ کو سنوار دیا۔ نہ جانے کہاں سے' حمیداں کی آنکھوں میں سارا سمندر گھس آیا۔ چاروں اور جل تھل ہو گیا۔

شیرے! حمیداں نے جذبات سے مغلوب ہو کر اس کا بازو تھام لیا ہچکیوں سے اس کا کمزور بدن کانپنے لگا۔ وہ جلدی سے جلدی اسے اپنی خوشخبری سنا دینا چاہتی تھی۔ اسے یہ بتا دینا چاہتی تھی کہ اب ان کی دنیا مکمل ہونے والی تھی۔ اب اسے تیسرا بندہ باہر سے لانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ تیسرا پھول ان کے اپنے اندر سے کھل اٹھنے کا منتظر تھا۔ وہ سب کچھ کہہ دینا چاہتی تھی مگر اسے مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے۔

اچھا چل اٹھ! جھلی کہیں کی! ایک منٹ میں رو پڑتی ہے۔ تیرے لیے ایک خوشخبری ہے! دیکھ تو سہی میں تیرے لیے کیا لایا ہوں مگر تجھے تھوڑی دیر کو آنکھیں بند رکھنا ہوں گی۔

وہ حمیداں کو حیرت زدہ چھوڑ کر اٹھا اور باہر سے کچھ لا کر حمیداں کو آنکھیں کھول دینے کو کہا۔

یہ کیا ہے؟ حمیداں حیرت سے کپڑے سے ڈھکی ہوئی چیز کو دیکھ کر بولی۔

ارے یہ کیا اٹھا لائے؟ اس نے شیرے کو زمین پر مٹی کے تیل کا چولہا رکھتے دیکھ کر پوچھا۔

بھئی آج سے تو اسی چولہے پر کھانا پکایا کرے گی۔ دیکھ' نہ لکڑیوں' اپلوں پھونکنی اور دھوئیں کا سیاپا نہ تیری آنکھوں کا نقصان!

اچھا! مگر شیرے مجھے اس کی کیا ضرورت ہے؟ میں نے کبھی شکایت تو نہیں کی۔ تو نے ایسے ہی تکلف کی!

تکلیف کیسی! کیا میں اپنی حمیداں کے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتا! اور ہاں اسے استعمال کرنا کونسا مشکل کام ہے۔ میں تجھے ابھی سکھا دیتا ہوں۔ آج تو مجھے اس پر انڈوں کا حلوہ بنا کر کھلا۔ کتنے دن ہو گئے ہیں مجھے وہ کھائے ہوئے۔ آج بڑا دل چاہ رہا ہے۔

شیرا اٹھا اور مٹی کے تیل کے چولہے کو ہر طرف سے ٹھونک بجا کر دیکھا۔ مٹی کا تیل دیکھا۔ لبالب بھرا ہوا تھا۔ پھر نئی نکور سوت کی سفید لمبی لمبی بتیاں کھینچ کر آدھی تیل میں ڈوبی چھوڑ دیں اور آدھی ذرا ذرا سی باہر۔ ہر طرح سے اطمینان کر لینے کے بعد وہ انگڑائی

لے کر اٹھا۔

میں ذرا کپڑے بدل لوں اور تو ماچس سلگا کر اسے اب اس طرح جلا لینا۔ اس نے حمیداں کو ہدایات دیں اور خود اٹھ کھڑا ہوا حمیداں نے ماچس کی ڈبیا ہاتھ میں لے لی۔

شیرے نے اندر کمرے میں پہنچنے سے پہلے یہ اچھی طرح سے یقین کر لیا کہ صحن میں سے اندر اور باہر کو جانے والے دروازے اس طرح سے بند ہوں کہ انہیں صحن میں سے کوئی کھول نہ سکے۔

